خیر امت کی تجدید کا مہینہ

rafeeqemanzil.com
/rafeeqemanzil

جلد: ۳۲ | شمارہ: ۵ | مئی ۲۰۱۹ء | شعبان المعظم و رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ
editor@rafeeqemanzil.com

₹15 | سالانہ ₹160

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Ph: 8447622919 | Email: officermgp@sio-india.org | www.rafeeqemanzil.com

Printed on behalf of The Students Islamic Organisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor : Saud Firoz Ahmed**

ذکر

سچی توبہ

محمد اکمل فلاحی

اللہ کو یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ لوگ گناہ کریں، البتہ اسے یہ ضرور پسند ہے کہ اگر بندہ سے کبھی کوئی گناہ سرزد ہوجائے اور دیر کیے بغیر وہ 'سچی توبہ' کرکے اپنے رب سے معافی مانگ لے تو وہ اسے معاف کردے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو سچی توبہ کی طرف دعوت دی ہے۔ "یا ایھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ النصوحۃ"۔ حضرت عمرؓ نے توبۃ النصوح کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ توبہ کے بعد آدمی گناہ کا اعادہ تو درکنار، اُس کے ارتکاب کا ارادہ تک نہ کرے۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایک بدّو (دیہاتی) کو جلدی جلدی توبہ واستغفار کے الفاظ زبان سے ادا کرتے سنا تو فرمایا: 'یہ توبۃ الکذّابین (جھوٹے لوگوں کی توبہ) ہے۔ اس نے پوچھا پھر صحیح توبہ کیا ہے؟ فرمایا، اس کے ساتھ چھ چیزیں ہونی چاہئیں: جو کچھ ہو چکا ہے اس پر نادم ہو، اپنے جن فرائض سے غفلت برتی ہو اس کو ادا کر، جس کا حق مارا ہو اس کو واپس کر، جس کو تکلیف پہنچائی ہو اس سے معافی مانگ، آئندہ کے لیے عزم کرلے کہ اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا، اپنے نفس کو اللہ کی اطاعت میں گھلا دے جس طرح تو نے اب تک اسے معصیت کا خوگر بنائے رکھا ہے اور اس کو اطاعت کی تلخی کا مزہ چکھا جس طرح اب تک تو اسے معصیتوں کی حلاوت کا مزہ چکھاتا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہی 'سچی توبہ' مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی 'سچی توبہ' سے خوش ہوتا ہے۔ یہی توبہ، توبہ ہے۔ ورنہ توبہ بے معنیٰ ہے۔ توبہ کرنے کے بعد کیا یہ جائز ہوگا کہ ہم گناہ کے سلسلے کو جاری رکھیں؟ کیا یہ بات معقول ہوگی کہ ہم معصیت کی آگ مزید بھڑکاتے رہیں؟ کیا یہ صحیح ہوگا کہ ہم والدین کی نافرمانی کرتے رہیں؟ ان کو تکلیف پہنچاتے رہیں؟ جھوٹ بولتے رہیں؟ غیبت کرتے رہیں؟ چغلی کھاتے رہیں؟ مذاق اڑاتے رہیں؟ حسد کرتے رہیں؟ سینہ میں کینہ پالتے رہیں؟ کمزور کو ستاتے رہیں؟ یتیم کا مال کھاتے رہیں؟ سودی کاروبار چلاتے رہیں؟ رشوت کا لین دین کرتے رہیں؟ دوسروں کا حق مارتے رہیں؟ حرام طریقے سے مال کماتے اور کھاتے رہیں؟ دھوکہ دیتے رہیں؟ وعدہ خلافی کرتے رہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں! یہ توبہ نہیں، توبہ کا مذاق ہے! یہ سچائی نہیں، دھوکہ ہے! یہ انصاف نہیں، ظلم ہے! یہ خوفِ خدا نہیں، خدا سے بے خوفی کی دلیل ہے!

رمضان

خیرِ امت کی تجدید کا مہینہ

امت مسلمہ ایک انفرادی شان رکھنے والی امت ہے۔ اس روئے زمین پر نوع بہ نوع امتیں اور ملتیں موجود رہی ہیں اور اب بھی ہیں، تاہم امت مسلمہ کا موازنہ ان میں سے کسی امت وملت سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اللہ تعالی کی منظور نظر امت ہے۔ امت مسلمہ کا یہ امتیاز کسی نسلی، جغرافیائی یا لسانی برتری کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ اس وجہ سے ہے کہ اس امت کو اللہ تعالی نے ایک خاص اسکیم کے تحت اٹھایا ہے اور اس کے شانوں پر ایک عظیم الشان فرض عائد کیا ہے۔ یہ وہی منصب اور وہی فرض ہے جسے مختلف دور اور مختلف علاقوں میں انبیاء کرامؑ ادا کرتے رہے ہیں۔ اس امت کے منصب اور فرض منصبی کو قرآن کی روشنی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، شہادت علی الناس، اعلائے کلمۃ اللہ، قیام عدل وقسط، غلبہ اسلام، حکومت الٰہیہ کا قیام، اقامت قرآن اور اقامت دین جیسی گوناگوں اصطلاحوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس امت کا فرض یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں بسنے والے ہر انسان کا رشتہ اور دنیا کے ہر تمدن وتہذیب کی ڈور اللہ وحدہ لاشریک لہ سے جوڑ دے۔ اسی طرح اس امت کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک خدا شناس، انصاف پر مبنی، پر امن سماج کی تعمیر کے لیے جدوجہد کرے۔ یہی منصب اور یہی فرض امت مسلمہ کی انفرادیت ہے۔ اسی منصب اور اسی فرض کی بنا پر وہ اللہ تعالی کی محبوب ترین امت ہے۔

ایک وقت تھا جب اللہ تعالی نے اسی منصب پر بنی اسرائیل کو فائز کیا تھا۔ بنی اسرائیل کو یہ شرف حاصل تھا کہ اسے اللہ تعالی نے تمام انسانی گروہوں سے افضل قرار دیا تھا۔ لیکن بعد میں بنی اسرائیل کو اس مقام ومنصب سے معزول کر دیا گیا۔ اس معزولی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ بنی اسرائیل نے اپنے فرض منصبی کو ادا نہ کیا۔ اللہ سے کیے گئے عہد و پیمان کو وفا نہ کیا۔ اس بے وفائی کی تفصیلی سرگزشت اور بنی اسرائیل کی قرارداد جرم سورہ البقرۃ میں بیان کی گئی ہے۔ سورہ البقرۃ میں بنی اسرائیل کی قرارداد جرم اور امامتِ دنیا کے منصب سے اس کی معزولی کے فورا بعد ہی وہ آیات ہیں جن میں امت مسلمہ پر روزوں کو فرض کیا گیا اور رمضان کی تفصیلات بیان کی گئیں۔

بنی اسرائیل کا منصب، اس کا فرض منصبی، فرض منصبی ادا نہ کرنے کی وجہ سے منصب سے معزول کر دیا جانا، معزولی کے اسباب، اس مقام ومنصب پر امت مسلمہ کو فائز کرنا اور پھر رمضان اور اس کی تفصیلات کا بیان، اس قرآنی نظم کلام میں امت مسلمہ کی حیات وموت کا سبق پوشیدہ ہے۔ اس سبق کا خلاصہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کی زندگی فرض منصبی کی ادائیگی سے وابستہ ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس امت کو ایک بلند منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ اس منصب کے ساتھ اسے ایک ذمہ داری بھی عطا کی گئی ہے۔ وہ اس بلند منصب پر اسی وقت تک فائز رہے گی جب تک وہ اپنی ذمہ داری کو ادا کرتی رہے۔ جب وہ اپنی ذمہ داریوں کو طاق نسیاں کی زینت بنا دے گی، تو بعید از امکان نہیں کہ بنی اسرائیل کی طرح اللہ تعالی امت مسلمہ کو بھی معزول کر کے پھر کچھ اور افراد واقوام کو اس منصب پر براجمان کر دے۔ قرآن اشارہ کرتا ہے کہ ذمہ داری کو ادا کرنے اور معزولی کی ذلت سے بچنے کے لیے جن روحانی اور مادی طاقتوں سے لیس ہونا ناگزیر ہے، ان طاقتوں کا ایک اہم سرچشمہ رمضان اور اس کے روزے ہیں۔

ذمہ داری کو ادا کرنے اور معزولی کی ذلت سے بچنے کے لیے امت مسلمہ اور اس کے ہر فرد کی بنیادی ضرورت تقوی ہے۔ تقوی اُس روحانی کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی فکر، اس کے عمل، اس کے رویے، اس کی خلوت وجلوت، اس کے اعضاء وجوارح سب اللہ کی محبت سے معمور اور اس کے نور سے روشن ہوتے ہیں۔ یہ خیال ذہن میں مستحضر رہتا ہے کہ خدا دیکھ رہا ہے۔ روحانی کیفیت کے اس تجربے کے بعد ایک صالح انسان اور ایک صالح انسانی گروہ کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالی کی طرف سے عطا کردہ ذمہ داری سے ایک لمحے کے لیے بھی غفلت برتے۔ قرآن میں لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ کے الفاظ میں بتایا گیا کہ روزوں کا مقصد انسانوں میں اسی تقوی کی تخم ریزی ہے۔ روزے انسان کو تقوی کے اسی روحانی تجربے کی مشق کراتے ہیں۔

فرض منصبی کو ادا کرنے اور امامتِ دنیا کے منصب جلیل سے معزولی کی ذلت سے بچنے کے لیے احساس بندگی، نفس کی تربیت، اعلی کردار، مضبوط قوت ارادہ، محنت وجفاکشی، صبر واستقامت اور انسانوں سے قلبی ربط وتعلق جیسے اوصاف کی موجودگی بھی ناگزیر ہے۔ یہ تمام اوصاف روزوں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ روزے کی حالت میں انسان صبح سے شام تک اپنے آپ کو خورد ونوش اور زن وشو کے تعلقات سے باز رکھتا ہے۔ وہ کچھ کھانا یا کچھ پینا چاہتا ہے، لیکن کھانے اور پینے کا ارادہ کرتے ہی اسے

خیال آتا ہے کہ وہ آزاد نہیں ہے، بلکہ اپنے رب کا بندہ وغلام ہے، چنانچہ وہ فوراً کھانے یا پینے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے۔ پورے تیس دن صبح سے شام تک ہر لمحہ یہ خیال کہ وہ آزاد نہیں ہے، بلکہ اپنے رب کا بندہ وغلام ہے، انسان کے اندر شدید احساس بندگی پیدا کر دیتا ہے۔ روزے کی حالت میں انسان صبح سے شام تک اپنے نفس کی خواہشات پر قابو رکھتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ بری خواہشات کو اپنے دل میں گھر نہیں کرنے دیتا بلکہ جائز اور حلال خواہشات مثلاً کھانے پینے کی خواہش وغیرہ پر بھی لگام رکھتا ہے۔ ایک ماہ کی اس مسلسل مشق سے اس کے نفس کی تربیت ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جب اللہ کی رضا کے لیے حلال اور جائز خواہشات کو قابو میں رکھنا اس قدر اہم ہے تو پھر حرام اور ناجائز خواہشات سے اجتناب کتنا اہم ہوگا۔ بالآخر حرام اور کبائر سے اجتناب اس کا شعار بن جاتا ہے۔ روزے انسان کے کردار کی تربیت کرتے ہیں۔ روزے کی حالت میں انسان پر اجتماعی ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ اس کے لیے دروغ گوئی سے کام لینا، سب وشتم اور فریب دہی کا کام آسان نہیں ہوتا۔ روزہ دار کو "مَن صَامَ رَمَضَانَ اِیمانًا وَاحتِسابًا غُفِرَ لَهُ ما تَقَدَّمَ مِن ذَنبِهِ" (جس نے ایمان واحتساب کے ساتھ روزے رکھے اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے گئے، صحیح البخاری 1901) اور "مَن لَم یَدَع قَولَ الزُّورِ وَالعَمَلَ بِهِ فَلَیسَ لِلّٰه حَاجَةٌ اَن یَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ" (اگر کوئی شخص روزہ رکھ کر بھی جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا تو اللہ تعالی کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے، صحیح البخاری 6057) جیسی احادیث پر بھی عمل کرنا ہوتا ہے۔ رمضان میں یہ اور اس قسم کی متعدد قرآنی ونبوی تعلیمات انسان کے کردار کو بلندی عطا کرتی ہیں۔ رمضان انسان کی قوت ارادہ کو بھی مضبوط کرتا ہے۔ روزے کی حالت میں انسان خاموشی سے کچھ کھا اور کچھ پی سکتا ہے، لیکن وہ محض اپنے مضبوط ارادہ کے سبب ایسا نہیں کرتا۔ انسان کو اپنے ارادوں پر قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ رمضان انسان میں صبر، ضبط اور استقامت کی صلاحیت بھی پیدا کرتا ہے۔ صبح سے شام تک بھوکا اور پیاسا رہنا سہل کام نہیں ہے۔ حلق خشک ہو جاتا ہے، پیٹ پشت سے جا لگتا ہے لیکن روزہ دار ہمت نہیں ہارتا۔ وہ صبر کرتا ہے، ضبط سے کام لیتا ہے اور پوری استقامت کے ساتھ روزے مکمل کرتا ہے۔ روزہ انسانوں میں انسانوں کے تئیں محبت بھی پیدا کرتا ہے۔ روزہ دار کو روزے کی حالت میں شدید بھوک کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس ان انسانوں کے درد کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے جنہیں دو وقت کی روٹی میسر نہیں۔ وہ بھوکوں کا ہمدرد بن جاتا ہے اور انہیں کھانا کھلانے کا بندوست کرنے لگتا ہے۔ پھر اس کے سامنے حضرت ابن عباس ؓ کی رسول اللہ ﷺ کے حق میں یہ گواہی سامنے آتی ہے کہ "كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلى الله عَلَیهِ وَسَلَّمَ اَجوَدَ النَّاسِ وَكَانَ اَجوَدُ ما یَكُونُ فِي رَمَضَانِ... الخ" (اللہ کے رسول ﷺ تمام انسانوں سے زیادہ سخی تھے، اور سب سے زیادہ سخاوت کا مظاہرہ، وہ رمضان میں کیا کرتے تھے، صحیح البخاری 3220) اس کے بعد تو وہ جود وسخاوت، انسانوں سے ہمدردی اور یگانگت کی مجسم تصویر بن جاتا ہے۔

تقوی، احساس بندگی، نفس کی تربیت، اعلی کردار، مضبوط قوت ارادہ، محنت وجفاکشی، صبر واستقامت اور انسانوں سے گہرا ربط وتعلق وہ بنیادی اوصاف ہیں جنہیں اختیار کیے بغیر امت مسلمہ کا فرض منصبی ادا نہیں ہو سکتا۔ صرف اتنا بھی کافی نہیں ہے کہ ملت کے چیدہ افراد میں انفرادی طور پر یہ اوصاف پیدا ہو جائیں بلکہ لازمی ہے کہ یہ اوصاف بہ حیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ کی اجتماعی شناخت بن جائیں۔ یہ امت کے منصب کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہے۔

ایک طرف امت کا منصب اور اس کا فرض منصبی ہے اور دوسری طرف اس فرض منصبی کی صحیح ادائیگی کے لیے مذکورہ بالا لوازمات ہیں۔ ان دونوں کا گہرا رشتہ رمضان سے ہے۔ رمضان میں روزوں کا اہتمام ہوگا تو فرد کے اندر وہ لوازمات پیدا ہوں گے۔ لوازمات پیدا ہوں گے تو فرض منصبی ادا ہوگا۔ فرض منصبی ادا ہوگا تو امت اپنے اصل منصب پر قائم ودائم رہے گی۔

یہ وقت کی بڑی اور اہم ضرورت ہے کہ امت مسلمہ کے ہر فرد کے سامنے رمضان کا تعارف اس پہلو سے کرایا جائے۔ جب رمضان کا یہ تعارف سامنے آئے گا تو نہ صرف یہ کہ فرد میں اپنے آپ کو بدلنے کا جذبہ پیدا ہوگا بلکہ یکایک پوری امت مسلمہ کے اندر ایک بہتر تبدیلی محسوس کی جائے گی۔ یہیں سے امت مسلمہ کے حقیقی مسائل کے تدارک کی سبیل پیدا ہوگی۔ ناخواندگی، غربت اور ایوانوں میں متناسب نمائندگی اس امت کے اصل مسائل نہیں ہیں، اس لیے تعلیم، معاشی بہتری اور سیاسی طاقت اصل حل بھی نہیں ہیں۔ اس امت کا بنیادی مسئلہ اس کے فرض منصبی کے ارد گرد گردش کرتا ہے۔ فرض منصبی کی طرف رجوع اور اس سے وابستگی ہی حقیقی حل ہے۔

سعود فیروز

رمضان تقویٰ اور سماج

ڈاکٹر محمد رفعت

ارکانِ اسلام کی اہمیت سے سب واقف ہیں۔ اسلام کے نظام میں ان کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''اسلام کی بنیاد، پانچ امور پر ہے۔ گواہی دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، حج کی ادائیگی اور رمضان میں روزے رکھنا۔''

یہ پانچ اساسی امور ایسے ہیں کہ ان کا تعلق، ہر صاحبِ ایمان کی انفرادی زندگی سے بھی ہے اور پورے سماج سے بھی۔ ہر رکن اسلام کی اپنی معنویت ہے جو اس کے فیوض و برکات کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ صومِ رمضان کا خاص فیض یہ ہے کہ اس سے اہلِ ایمان کو تقویٰ کی کیفیت حاصل ہوتی ہے (اگر وہ اس کے لیے ضروری کوشش کریں اور اللہ کا فضل بھی ان کے شاملِ حال ہو)۔ رمضان اور تقویٰ کے اس تعلق کے نشاندہی قرآن مجید میں اس طرح کی گئی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ○

(البقرۃ: ۱۸۳)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے، جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔''

مسلم سماج اور رمضان:

رمضان کی آمد کے وہ سب لوگ منتظر ہوتے ہیں جو اپنی تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رمضان کے دنوں میں اللہ کی عبادت کر کے توقع رکھتے ہیں کہ ان کا ایمان تازہ ہوگا اور تقویٰ کی کیفیت ان کو حاصل ہوگی۔ ان کا یہ ذوق وشوق بہت مبارک ہے اور ان کے ایمان کی علامت ہے۔ البتہ ایسے نیک افراد کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ خود رمضان کی برکتوں سے مستفید ہونے کے

ساتھ ساتھ، پورے مسلم سماج کو رمضان کے فائدوں میں شریک کرنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔ اس کے لیے دو کام ضروری ہیں۔ پہلا کام، رمضان کا استقبال ہے جس کا منصوبہ بند اہتمام ہونا چاہیے۔ دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ رمضان کے پورے مہینے میں احترامِ رمضان کی تاکید کی جاتی رہے۔ ہر خاص و عام کو یاد دلایا جائے کہ یہ دن رمضان کے ہیں اور پورے مسلم سماج پر نیکی کی کیفیت چھا جانی چاہیے۔ اگر معقول عذر کی بنا پر کوئی روزہ نہ رکھ سکتا ہو تو وہ بھی برسرِ عام کھانے پینے سے باز رہے۔ اسی طرح برائیاں سماج سے مٹ جائیں یا کم از کم علانیہ ان کا صدور نہ ہو۔ نیک افراد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو اندیشہ ہے کہ مسلم سماج کا قابلِ لحاظ حصہ، رمضان کی برکتوں سے محروم رہ جائے گا۔

استقبالِ رمضان کے معنیٰ یہ ہیں کہ رمضان کی ابتدا سے چند دن قبل، مسلمانوں کو رمضان کے بارے میں بتایا جائے، اس کی اہمیت یاد دلائی جائے اور اس کے اندر انجام دیے جانے والے اعمالِ خیر کا تذکرہ کیا جائے۔ خود نبی کریم ﷺ نے استقبالِ رمضان کا اہتمام کیا ہے۔

استقبالِ رمضان کا خطبہ:

ماہِ رمضان کے شروع ہونے سے چند دن پہلے، نبوی نمونے کی پیروی میں، مسلمانوں کے ذمہ داروں کو رمضان کے استقبال کا اہتمام کرنا چاہیے۔ نبی ﷺ کے خطبہ کا ذکر اس حدیث میں ہے:

حضرت سلمان فارسیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شعبان کی آخری تاریخ کو خطبہ دیا اور فرمایا:

> ”اے لوگو! تمہارے اوپر ایک بڑا ابزرگ مہینہ سایہ فگن ہوا ہے۔ یہ بڑی برکت والا مہینہ ہے۔ اس کی ایک رات ایسی ہے کہ ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ نے اس مہینے کے روزے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں کے قیام کو نفل قرار دیا ہے۔ جس شخص نے اس مہینے میں کوئی نیکی کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی تو وہ اس شخص کے مانند ہے، جس نے دوسرے دنوں میں کوئی فرض ادا کیا۔ جس نے اس مہینے میں ایک فرض ادا کیا تو وہ ایسا ہے جیسے دوسرے دنوں میں اس نے ستر فرض ادا کیے۔ رمضان صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ایک دوسرے سے ہمدردی کا مہینہ ہے۔ اس مہینے میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص، اس مہینے میں کسی روزے دار کا روزہ کھلوائے تو وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور اس کی گردن کو دوزخ کی سزا سے بچانے کا ذریعہ ہے۔ اس کے لیے اتنا ہی اجر ہے جتنا اس روزہ دار کے لیے روزہ رکھنے کا ہے، بغیر اس کے کہ روزے دار کے اجر میں کوئی کمی واقع ہو۔
>
> (راوی کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا کہ ”اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر ایک کو یہ وسعت حاصل نہیں ہے کہ کسی روزے دار کا روزہ کھلوائے۔“ جواب میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:)
>
> اللہ تعالیٰ یہ اجر اُس شخص کو بھی دے گا جو کسی روزے دار کو دودھ کی لسی سے روزہ کھلوا دے یا ایک کھجور کھلا دے یا ایک گھونٹ پانی پلا دے۔ اور جو شخص کسی روزے دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے تو اللہ تعالیٰ اس کو میرے حوض سے پانی پلائے گا۔ اس حوض سے پانی پی کر پھر اسے پیاس محسوس نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ یہ وہ مہینہ ہے جس کے آغاز میں رحمت ہے، وسط میں مغفرت ہے اور آخر میں دوزخ سے رہائی ہے۔ جس نے رمضان کے مہینے میں اپنے غلام سے ہلکی خدمت لی، اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور اس کو دوزخ سے آزاد کر دے گا۔“

یہ خطبہ بہت جامع اور مؤثر ہے۔ اس میں رمضان کے مہینے کی اہمیت کے خاص پہلو یہ بتائے گئے کہ یہ برکت والا ہے خصوصاً **لیلة القدر** برکت والی رات ہے۔ اس میں نیکیوں کا اجر غیر معمولی طور پر بڑھ جاتا ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے۔ اس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس میں رحمت و مغفرت ہے اور جہنم سے رہائی کا سامان ہے۔

رمضان کی اِن برکات کی نشاندہی کے ساتھ آپ ﷺ نے اس قیمتی خطاب میں رمضان کے اعمالِ خیر کی طرف توجہ دلائی: روزے (جو فرض ہیں)، راتوں میں قیام، اہلِ ایمان کے ساتھ ہمدردی، روزے دار کا روزہ کھلوانا، غلام (یا ملازم) سے ہلکی خدمت لینا۔

اِن اعمالِ خیر کے علاوہ دو اہم عبادتوں کا ذکر دیگر احادیث میں ہے یعنی آخری عشرے میں اعتکاف (جو فرضِ کفایہ ہے) اور صدقہ فطر کی ادائیگی (جو استطاعت رکھنے والوں پر واجب ہے)۔

روزے کا ظاہر:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ”ابن آدم کا ہر عمل اس کے لیے کئی گنا بڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک نیکی، دس گنی اور دس گنی سے سات سو گنی تک بڑھائی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”روزے کا معاملہ اس سے جدا ہے کیونکہ وہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ روزے دار اپنی شہواتِ نفس اور اپنے کھانے پینے کو میرے لیے چھوڑتا ہے۔“ (یہ

حدیث کاابتدائی حصہ ہے)

حدیثِ نبوی کے مندرجہ بالا حصے میں صوم کی تعریف بیان ہوئی ہے یعنی ’’اللہ کی رضا کے لیے کھانے پینے کواور خواہشِ نفس کی تسکین کو چھوڑ دینا۔‘‘

روزے کی روح:

روزے کے اس ظاہر کے ساتھ اُس کا ایک حقیقی مقصود ہے جس کو جاننا چاہیے۔ نبی ﷺ نے مندرجہ بالا ارشاد کے آخر میں فرمایا:

’’روزہ ڈھال ہے، پس جب کوئی شخص، تم میں سے، روزے سے ہوتو اسے چاہیے کہ نہ اس میں بدکلامی کرے اور نہ دنگا فساد کرے۔ اگر کوئی شخص اس سے گالی گلوچ کرے یا لڑے تو وہ اس سے کہہ دے کہ بھائی، میں روزے سے ہوں۔‘‘

اس تنبیہ سے معلوم ہوا کہ روزے کے ظاہر کے ساتھ، اس کی روح پر توجہ ضروری ہے یعنی برائیوں سے بچنا (خصوصاً زبان کے غلط استعمال سے، مخلوقِ خدا کو تکلیف دینے سے اور سوءِ خُلق سے)۔ روزے کی اس اسپرٹ کی وضاحت ایک دوسری حدیث کرتی ہے:

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اگر کسی شخص نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔‘‘

اس ارشادِ نبوی کا حاصل یہ ہے کہ روزے کا ظاہر تو اس لیے فرض کیا گیا تھا کہ روزے دار اس ظاہری شکل (یعنی کھانے پینے اور خواہش کی تسکین چھوڑ دینے) کے ذریعے اپنے نفس کو اللہ کی فرماں برداری کا عادی بنالیں۔ اب اگر نفسِ انسانی کی یہ تربیت نہ ہوئی اور انسان برائیاں کرتا رہا تو محض کھانا پینا چھوڑ دینے سے کیا فائدہ ہوا؟

روزے کی یہ روح (یعنی تقویٰ کا حصول) سامنے آجانے کے بعد ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ روزے کا حقیقی فائدہ حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کی تدبیر ’’عزمِ صادق‘‘ یعنی پختہ ارادہ ہے۔ اس قوتِ ارادی کو بیدار کرنے میں نیک لوگوں کی صحبت مددگار ہوتی ہے۔ اللہ کے مخلص بندوں کے حالات کا تذکرہ بھی صحبتِ صالحہ کا بدل ثابت ہوتا ہے۔ روزے کی برکات حاصل کرنے کی دوسری تدبیر، قرآنِ مجید کی تلاوت اور اس پر تدبر ہے۔

قرآنِ مجید سے وابستگی:

انسان کی سعادت اس میں ہے کہ وہ اللہ پر مخلصانہ ایمان لانے کے بعد اُس کی اطاعت وفرماں برداری کا پکا ارادہ کرے اور راہِ حق پر یکسوئی و ہمت کے ساتھ چل پڑے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جسم اور نفس کو اللہ کی بندگی کا عادی بنائے اور اس سلسلے میں اپنے آپ کو ذرا ڈھیل نہ دے۔ ضبطِ نفس کے ساتھ اُسے اپنے افکار، خیالات اور اندرون کی دنیا پر بھی توجہ دینی ہوگی۔ وہ فلاح اسی وقت پا سکے گا جب وہ باطل افکار سے نجات پالے اور اللہ کی ہدایت کی روشنی میں زندگی گزارے۔ اندھیروں سے روشنی میں آنے کے لیے، اللہ کی کتاب — قرآنِ مجید سے وابستگی ضروری ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے روزے کی عبادت کے لیے اس مہینے (رمضان) کا انتخاب کیا، جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ رمضان کی آمد اہلِ ایمان کو یاد دلاتی ہے کہ اب ان کو روزے رکھنے چاہئیں اور اسی طرح یہ بات بھی اہلِ ایمان کو یاد دلاتی ہے کہ اُن کو قرآن کی طرف متوجہ ہوجانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

(سورہ البقرہ:185)

’’رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے، جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب جو شخص اس مہینے کو پائے، اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے، سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے یہ طریقہ تم کو بتایا جارہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کرسکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے، اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار واعتراف کرو اور شکرگزار بنو۔‘‘

عظمتِ رمضان کے تقاضے:

رمضان کے مہینے کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس میں کتابِ ہدایت نازل ہوئی، یہ عظمت، اہلِ ایمان سے کچھ تقاضے کرتی ہے، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں بیان کیا گیا ہے:

(الف) اس مہینے کے روزے رکھیں۔

(ب) نعمتِ ہدایت کا شکرادا کریں یعنی ہدایت پر عمل کریں۔

(ج) اللہ کی کبریائی کا اظہار واعتراف کریں یعنی دنیا میں حق کی آواز

بلند کریں۔ جب خود حق سے آشنا ہوجائیں تو اسے چھپا کر نہ رکھیں بلکہ انسانوں کو اس سے واقف کرائیں۔ نبی کریم ﷺ کو یہ ہدایت، ان الفاظ میں دی گئی:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ o قُمْ فَأَنْذِرْ o وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ o

(سورہ مدثر: آیات 01 تا 03)

''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے! اٹھو اور خبردار کرو اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔''

یہ سہ گانہ تقاضے اس وقت پورے ہوسکیں گے جب اہلِ ایمان، قرآن سے واقف ہوں۔ رمضان اس کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس مہینے میں مسلمانوں کو فرداً فرداً قرآن مجید پڑھنے کا اور اس پر غور کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ نمازِ تراویح میں اُن کو پورا قرآن سننا چاہیے تاکہ ان کے ذہن اور قلب، کتابِ ہدایت کی روشنی سے منور ہوسکیں۔ خود اللہ کے نبی ﷺ کو ہر سال قرآن سنایا جاتا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ''نبی ﷺ کے سامنے ہر سال (ماہِ رمضان میں) ایک مرتبہ قرآن مجید پیش کیا جاتا تھا مگر جس سال آپ نے انتقال فرمایا، اس میں آپ کو دو مرتبہ قرآن مجید سنایا گیا۔ اور آپ ہر سال دَس دِن اعتکاف کیا کرتے تھے مگر جس سال آپ کی وفات ہوئی، اس میں آپ نے بیس دن اعتکاف فرمایا۔''

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ، بھلائی کے معاملے میں تمام انسانوں سے زیادہ فیاض تھے اور خاص طور پر آپ رمضان میں بے انتہا فیاض ہوتے تھے۔ جبریل علیہ السلام، رمضان کے دوران ہر رات کو رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تھے اور حضور انھیں قرآن مجید سناتے تھے۔ جب جبریلؑ آپ سے ملتے تھے تو حضور بھلائی کے معاملے میں چلتی ہوئی ہوا سے بھی زیادہ فیاض ہوتے تھے۔''

نبی کریم ﷺ کا حضرت جبرئیلؑ کو قرآن سنانا اور حضرت جبرئیلؑ کا حضور ﷺ کو قرآن سنانا، یہ دونوں کام مذکورہ بالا احادیث میں مذکور ہیں۔ مسلمان سماج کو یہ نمونہ سامنے رکھنا چاہیے اور رمضان المبارک میں قرآن سننے کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور سنانے کا بھی۔

Dr. Mohammad Rafat
Professor,
Deptt. of Applied Sciences & Humanities,
Jamia Millia Islamia,New Delhi-110025
Editor, Zindagi-e-Nau,(Urdu)Monthly
New Delhi

”یہ بات بھی اس سے پہلے میں بیان کرچکا ہوں کہ نماز، روزے، حج اور زکوۃ کے نام سے جو عبادتیں ہم پر فرض کی گئی ہیں ان کا اصل مقصد اسی بڑی عبادت کے لیے ہم کو تیار کرنا ہے۔ ان کو فرض کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر تم نے دن میں پانچ وقت رکوع اور سجدہ کر لیا، اور رمضان میں تیس دن تک صبح سے شام تک بھوک پیاس برداشت کرلی اور مالدار ہونے کی صورت میں سالانہ زکوۃ اور عمر میں ایک مرتبہ حج ادا کر دیا، تو اللہ کا جو کچھ تم پر حق تھا وہ ادا ہوگیا اور اس کے بعد تم اس کی بندگی سے آزاد ہو گئے کہ جو چاہو کرتے پھرو، بلکہ دراصل ان عبادتوں کو فرض کرنے کی غرض یہی ہے کہ ان کے ذریعہ سے آدمی کی تربیت کی جائے اور اس کو اس قابل بنا دیا جائے کہ اس کی پوری زندگی اللہ کی عبادت بن جائے۔“

مولانا سید ابو الاعلی مودودیؒ
(ماخوذ از: خطبات/عبادات- بندگی کی تربیت)

نظم

رمضان قوت ضبط اور قوت کار کا مہینہ

”آپ روزے سے رہیں، اور پھر آپ روزا یسے نہیں رہیں“

محی الدین غازی

انسانی شخصیت کی تعمیر وترقی میں عبادتوں کا غیر معمولی کردار ہوتا ہے۔ ہر عبادت انسان کی پوری شخصیت پر بہت اعلی اثرات مرتب کرسکتی ہے، تاہم ہر عبادت میں کچھ خاص معنویت بھی محسوس ہوتی ہے۔ ایمان کا مطلب ہوتا ہے انسان کا دل اللہ کے لئے ہوگیا، نماز کا مطلب ہوتا ہے انسان کا رخ اللہ کی طرف ہوگیا، زکات کا مطلب ہوتا ہے انسان کی دولت اللہ کے لئے وقف ہوگئی، حج کا مطلب ہوتا ہے انسان کی حرکت اللہ کے لئے ہوگئی، اور روزے کا مطلب ہوتا ہے انسان کی قوت اللہ کی تابع ہوگئی۔

انسان کی اصل طاقت یہ ہے کہ اسے قوت ضبط حاصل ہوجائے، اور وہ خود اپنے آپ پر قابو پالے، اس کی بھوک اور پیاس سے لے کر اس کی ہر چاہ اور ہر طلب خود اس کے کنٹرول میں رہے۔ روزہ انسان کو اپنی یہ خفیہ طاقت جاننے، آزمانے اور بڑھانے کا موقع دیتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوجوانوں کو نکاح کی ترغیب دی، اور جو نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھے اسے روزے رکھنے کی تلقین کی، کیوں کہ نکاح کرنے سے خواہش کو تکمیل کا صحیح راستہ مل جاتا ہے، اور روزے رکھنے سے خواہش کو قابو میں رکھنے کی طاقت حاصل ہوجاتی ہے۔ انسان یا تو خواہش کی صحیح تکمیل کرے، یا پھر خواہش کو قابو میں

رکھے، کیوں کہ تیسرا راستہ تباہی کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے۔ نفس سے مجاہدہ کرنے میں روزے کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں روزے داروں کا ذکر کیا گیا اور اسی سے متصل شرم گاہ کی حفاظت کرنے والوں کا ذکر کیا گیا۔ اس ترتیب میں بھی اسی غیر معمولی قوت کی طرف اشارہ ہے جو روزہ دار کو خود اپنے سلسلے میں حاصل ہوجاتی ہے۔ اور جس کے بعد وہ زندگی کے سب سے خطرناک محاذ جنگ میں سرخ رو رہتا ہے۔

رمضان کا مہینہ ایک مومن انسان کو اس کی اپنی مگر خود اس سے پوشیدہ قوت کار سے آگاہ کرتا ہے۔ رمضان کے مہینے میں اسے اپنے بارے میں حیرت انگیز باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ پورے ایک ماہ مسلسل روزے رکھ سکتا ہے، اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ رات میں دیر سے سو کر بھی فجر سے کافی پہلے اٹھ سکتا ہے، اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ طویل تراویح اور تہجد پڑھ سکتا ہے، اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے آپ کو ذکر و تلاوت میں مشغول رکھ سکتا ہے، اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں کافی دولت خرچ کرسکتا ہے، اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ وہ اپنی نگاہ پر اپنی زبان پر اور اپنے غصے پر غیر معمولی حد تک قابو رکھ سکتا ہے۔

روزے رکھنے کا تقاضا ہوتا ہے کہ آپ کے شب وروز میں بہت بڑی تبدیلی آجائے۔ آپ کی قوت ضبط کے ساتھ قوت کار بھی بہت زیادہ بڑھ جائے، آپ کی فرصت کے اوقات بہت کم ہوجائیں، اور آپ کی مصروفیات میں با مقصد مصروفیات کا تناسب بہت زیادہ ہوجائے۔ ”آپ روزے سے رہیں، اور اس کے نتیجے میں آپ روزا یسے نہیں رہیں۔“ رمضان کے مہینے میں اللہ کی طرف سے عمل کا ثواب بڑھتا ہے، عمل کی طاقت بھی بڑھتی ہے، عمل کا جذبہ بھی بڑھتا ہے، یہ سب اللہ کی طرف سے خصوصی طور سے عطا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بندوں کی طرف سے عمل بڑھنا چاہیے۔

روزے رکھنے کا تقاضا ہوتا ہے کہ آپ کے شب وروز میں بہت بڑی تبدیلی آجائے۔ آپ کی قوت ضبط کے ساتھ قوت کار بھی بہت زیادہ بڑھ جائے، آپ کی فرصت کے اوقات بہت کم ہوجائیں، اور آپ کی مصروفیات میں با مقصد مصروفیات کا تناسب بہت زیادہ ہوجائے۔ ”آپ روزے سے رہیں، اور اس کے نتیجے میں آپ روزا یسے نہیں رہیں۔“

رمضان کے مہینے میں اللہ کے رسول ﷺ کا نمونہ اگر سامنے رہے، تو رمضان میں مطلوب تبدیلیوں کو بہت اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے: ”نبی ﷺ خیر کے معاملے میں سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے، اور وہ سب سے زیادہ سخی رمضان میں ہوجاتے تھے جب جبریلؑ رمضان کے پورے مہینے کی ہر رات آپ سے ملتے تھے، اور نبی ﷺ انہیں قرآن سناتے تھے، جب جبریل علیہ السلام آپ سے ملتے تھے تو آپ تیز ہواؤں سے زیادہ فیاض ہوجاتے تھے۔“ اس روایت کی رو سے ماہ رمضان میں آپ ﷺ کی فیاضی جو ویسے ہی سب سے زیادہ ہوتی تھی، بہت بڑھ جاتی تھی، اور قرآن مجید کی خصوصی تلاوت و مدارست کی مصروفیت بھی (پہلے سے ہی مصروفیات سے بھرپور) معمولات میں شامل ہوجاتی تھی۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ”جب رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوتا تو آپ اپنی کمر کس لیتے، اپنی راتوں کو زندہ کردیتے، اور اپنے گھر والوں کو بیدار رکھتے۔“ یہ اس عظیم انسان کی کیفیت ہوتی تھی جو سال بھر قُمِ الّیلَ اِلّا قَلِیلًا (رات میں قیام کرو مگر تھوڑا حصہ، سورہ المزمل، آیت 02) پر عمل پیرا رہتا تھا۔

رمضان کے مہینے کو عظیم فتوحات کے حوالے سے بھی یاد کیا جاتا ہے، درحقیقت فتوحات کا کسی خاص مہینے میں ہونا ایک خوب صورت اتفاق ہوسکتا ہے، معرکے اور فتوحات کسی خاص مہینے کا انتظار نہیں کرتے ہیں۔ البتہ میدان کارزار اور معرکہ حیات میں کامیابی اور کامرانی کی اہلیت رکھنے والے طاقت ور مجاہدوں کی تیاری کے لئے رمضان سب سے مناسب موقع ہوتا ہے۔

رمضان قوت ضبط اور قوت کار دونوں کو پالینے کا مہینہ ہے۔ یہ فرصت کو مصروفیت میں اور مصروفیات کو بامقصد مصروفیات میں بدل دینے کا مہینہ ہے۔ اور اس طرح رمضان کے مہینہ کا اختتام ایک بامقصد سال کا خوب صورت آغاز بن جاتا ہے۔ اگر تعبیر کی غلطی کا اندیشہ نہیں ہوتو کہا جاسکتا ہے کہ بندہ مومن کی سال گرہ کا دن اصل میں عید الفطر کا دن ہوتا ہے، جب وہ ایک ماہ کی تربیت کے بعد اپنی زندگی کے ایک پہلے سے مختلف اور پہلے سے بہتر سال کا طاقت ور آغاز کر رہا ہوتا ہے۔

Dr. Muhiuddin Ghazi
Dean, Faculty of Qura'n
Al Jamia Al Islamiya, Santhapuram
KERALA
email:mohiuddin.ghazi@gmail.com

فلسفہ صوم رمضان

سید رضوی

رمضان اسلام کی بنیادی عبادتوں میں سے ایک ہے جو انسان کو ضبط نفس، تقویٰ، انکساری، غریبوں کے تئیں ہمدردی، خدا کے تئیں خلوص اور آخرت میں کامیابی عطا کرتا ہے۔ روزے آپ کو اس قابل بناتے ہیں کہ آپ نفس کی بندگی، شہوت، لالچ، استکبار اور حسد جیسی بری صفات پر قابو پا سکیں۔

روزوں کے ذریعے آپ اپنے آپ کو مادی لطف اندوزی سے باز رکھتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے پیدا ہونے والی دنیاوی خواہشات کو لگام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کی حیثیت ایک ایسے مریض کی ہوتی ہے جسے نہ کھانے کی فکر ہوتی ہے نہ پینے کی، بلکہ ایک ہی فکر اس کی دامن گیر ہوتی ہے کہ کیسے اپنے برے اعمال کی بیماری سے شفا پا جاؤں۔

روزے نفس کی خواہشات کی تربیت کرتے ہیں، اور مادی مسرتوں سے انسان کو بے زار کر دیتے ہیں۔ اسی ذریعہ سے ایک انسان میں قلب کا تزکیہ، بدن کی طہارت، باطن و ظاہر کی اصلاح، نعمتوں پر جذبہ شکر، ضرورت مندوں کے لیے صدقات، عاجزی وانکساری میں اضافہ اور اللہ کی پناہ میں آنے کی دیگر تمام صفات پیدا ہوتی ہیں۔ اسی کے ذریعے تمام دنیاوی خواہشات کا خاتمہ، برائیوں کا خاتمہ اور اچھائیوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ روزوں کے فوائد اس قدر ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ روزوں کی تربیت کا فرد پر ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ فرد پر عادتوں اور خواہشات کی حکمرانی ختم ہو جاتی ہے اور فرد حسی خواہشات (Sensual Desires) کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے۔ سب سے بدترین اور خطرناک حکمرانی غلط عادتوں اور حسی خواہشات کی حکمرانی ہے۔ آزاد شخص وہی ہے جو کسی عادت کا غلام نہیں ہے اور جو اپنی مضبوط قوت ارادہ سے اپنی تمام عادتوں پر قابو رکھتا ہو۔ اس قسم کی آزادی اور روحانی کمال چند اعمال کا تقاضا کرتا ہے، جن کی ابتداء روزوں سے ہوتی ہے۔

روزے جذبات اور احساسات کو بیدار کرتے ہیں۔ خوش حال اور کھاتے پیتے گھرانوں کے افراد جو پورے سال بھوکے افراد سے بے خبر ہوتے ہیں، روزوں

کے ذریعے وہ بھوکے افراد کی بھوک اوران کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ پھران کا جذبہ اوراحساس بیدار ہوجاتا ہے۔ وہ بھوکے افراد کی بھوک مٹانے کے لیے کمر بستہ ہوتے ہیں۔ نتیجہ میں سماج کے مختلف طبقات کے مابین فاصلہ کم ہوتا ہے۔ رمضان کے مقدس مہینے میں روزوں کا اہتمام کرنے سے مساوات واتحاد کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس مہینے میں خوشحال اور غریب تمام افراد خواہشات کی پیروی سے دور رہ کر ایک جیسی زندگی گزارتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض قرار دیے ہیں تا کہ انسان اللہ کو یاد کرے۔ انسان اپنے آپ کو بہتر جانتا ہے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ اپنی خواہشات پر قابو پالے۔ وہ آخرت کو یاد کرتا ہے۔ عمل صالح کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اپنی اخروی زندگی کے لیے اعمال صالح جمع کررکھتا ہے۔ اسے بھوک اور پیاس کا تجربہ ہوتا ہے، چنانچہ اس کے اندر غریبوں اور ضرورت مندوں کے تئیں ہمدردی اور ان کی مدد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ صحت مند ہوجاتا ہے۔ اس قابل ہو جاتا ہے کہ حصول کمال، جو اس کا طئے شدہ ہدف ہے، کی جانب آگے بڑھ سکے۔

یہ ضروری ہے کہ آپ کے ساتھ ساتھ آپ کے تمام اعضاء وجوارح بھی روزہ رکھیں۔ آپ کے کان، آنکھ اور زبان وغیرہ کوئی غلط کام نہ کریں۔ آپ کے ہاتھ، پیر اور جسم کے دوسرے اعضاء کسی گناہ کا ارتکاب نہ کریں۔ تبھی آپ کے روزے بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت حاصل کریں گے۔ جب آپ روزے سے ہوں تو آپ کا برتاؤ دوسرے دنوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہو۔ آپ کی زبان بے کار کی باتوں اور لغو گوئی سے باز رہے۔ آپ دروغ گوئی سے کام نہ لیں۔ کسی کا مذاق نہ اڑائیں۔ حجت وتکرار سے دور رہیں۔ حاسدانہ جذبات کو دل میں جگہ نہ دیں۔ دوسروں کی برائیاں بیان کرنے اور ٹوہ میں پڑنے سے گریز کریں۔ لوگوں کے لیے عام دنوں سے زیادہ رحم دل بنیں۔

روزوں کی حالت میں خواہشات پر لگام کسنا، بھوک اور پیاس کو برداشت کرنا، جسمانی خواہشات جو داخلی تحریک کو مہمیز دیتی ہیں، کے خلاف مزاحمت کرنا یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کے اندر اپنی ذات کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں اور انسان کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ مختلف خواہشات جیسے شہوانی ہیجان، غصہ اور انانیت کا آسانی سے شکار نہ ہوجائے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس کا دل اکثر غلط راہ پر لے جانے والی خواہشات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ مثلاً انسان غیر قانونی طریقے سے دولت اکٹھا کرتا ہے، ناجائز جنسی تعلقات میں مبتلا ہوتا ہے، عیاشی کرتا ہے اور اشتعال انگیزی کا شکار ہوجاتا ہے۔

ایسی کئی خواہشات، رغبات اور اشتعال انگیز جذبات ہوتے ہیں جو اچانک بھڑک اٹھتے ہیں اور بالآخر انسان کی عزت اور اس کے مقام ومرتبے کو برباد کردیتے ہیں۔ لیکن انسان کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنی قوت ارادہ کو مضبوط کرے، برائی کی طرف لے جانے والے ہر میلان کے خلاف استقامت کا مظاہرہ کرے اور ہر اشتعال انگیزی کا شکار نہ ہوجائے۔ دل میں پیدا ہونے والے ہر داعیہ پر لبیک نہ کہے۔ ناجائز خواہشات کے ہیجان کے وقت انسان کو اپنی ذات پر قابو رکھنا چاہیے، عقل عام (Common Sense) کا استعمال کرنا چاہیے، مستقبل پر نظر رکھنی چاہیے۔ آخرت کی کامیابی وناکامی کو مستحضر رکھنا چاہیے تاکہ وہ وقتی وعارضی رغبات کے لیے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے برباد نہ کرلے۔ اس قوت مزاحمت کو بتدریج مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فرد کو ایک ایسا موقع فراہم ہو جب کہ وہ اپنی خواہشات اور جسمانی مسرتوں کے خلاف لڑ سکے۔ رمضان کا مقدس مہینہ فرد کو یہ موقع فراہم کرتا ہے۔ روزے اس قوت کو مضبوط کرنے کے تمام مواقع فراہم کرتے ہیں۔ قرآن روزوں کے انوکھے فوائد ان لفظوں میں پیش کرتا ہے:

"اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کیا گیا تھا۔ تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔" (سورہ البقرۃ، آیت 183)

"گنتی کے چند دن۔ اس پر بھی جو کوئی مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرلے۔ اور جو لوگ ایک مسکین کو کھانا کھلاسکیں ان پر ایک روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ جو کوئی مزید نیکی کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔" (سورہ البقرۃ، آیت 184)

”رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر، اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ، سو جو کوئی تم میں اس مہینے میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔ اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔ اور چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو اور اللہ نے جو تمہیں ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تا کہ تم اس کے شکر گزار بنو۔“

روزہ ہر میدان کی ہر سمت میں تقویٰ کی تربیت کے عمل کی راہ ہموار کرتا ہے۔ انسانی روح اور جسم کی تربیت پر اس کے اثر کی وجہ سے، روزہ صرف امت محمد پر فرض نہیں کیا گیا بلکہ جیسا کہ اوپر کی آیات میں ذکر ہوا، یہ تاریخ کی دوسری قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔ قرآن کی درج بالا آیات یہ بھی بتاتی ہیں کہ رمضان کی پریشانی کو کم کرنے کے لیے اسے گنتی کے محض چند دنوں کے لیے فرض کیا گیا، پورے سال کے لیے نہیں۔ قرآن مریض اور مسافر کا بھی خیال کرتے ہوئے انہیں رخصت دیتا ہے اور انہیں اجازت دیتا ہے کہ شفایاب ہونے کے بعد یا سفر ختم ہونے کے بعد چھوٹے ہوئے روزوں کو مکمل کر لیں۔ اسی طرح قرآن ضعیف مرد و خواتین، دائمی امراض میں مبتلا مستقل مریضوں کو بھی رخصت عطا کرتا ہے۔

رمضان سے متعلق قرآنی آیات میں مریض اور مسافر سے متعلق احکام کی تکرار اس وجہ سے ہے کہ بعض افراد سوچ سکتے ہیں کہ روزہ نہ رکھنا بالکل غلط ہے لہٰذا وہ مریض یا مسافر کی حالت میں روزہ رکھنے پر اصرار کریں گے، اس لیے قرآن اس تکرار کے ذریعے مسلمانوں کو سمجھاتا ہے کہ روزہ ایک طرف محفوظ اور صحت مند افراد کے لیے حکم الٰہی ہے، وہیں دوسری طرف مریض یا مسافر کی حالت میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت بھی اللہ ہی کی طرف سے دی گئی ہے۔

سورہ البقرہ کی آیت 185 کے اختتام پر یہ الفاظ کہ ”اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا“ روزوں کی فرضیت کے حکم الٰہی کا فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ یہ الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگرچہ بظاہر روزوں میں سختی اور پابندیاں نظر آتی ہیں لیکن اس کا انجام بالآخر روحانی و مادی آسانی اور طمانیت پر ہی ہوتا ہے۔ یہ جملہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ الٰہی احکامات کسی ظالم و جابر کے احکامات نہیں ہوتے۔ کسی معاملے میں اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسا حکم دیتا ہے جسے کر گزرنے میں مشقت ہو تو ٹھیک اسی وقت اس عمل کو کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ آسان راہیں بھی بتا دیتا ہے۔ جیسا کہ روزوں کے معاملے میں ہوا۔ پہلے تو روزے فرض کیے گئے، پھر روزوں کی تمام تر اہمیت کے باوجود بیمار، مسافر اور ان افراد کو جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے، اس اہم عبادت سے یہ کہہ کر مستثنیٰ کر دیا گیا کہ وہ روزوں کی تعداد دوسرے دنوں میں مکمل کر لیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر وہ شخص جو روزہ رکھ سکتا ہے اسے لازماً سال میں ایک ماہ روزے رکھنا چاہیے، کیوں کہ یہ اس کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے کوئی شخص اگر بیمار یا سفر کی حالت میں ہے تو وہ شفایاب ہو جانے یا سفر ختم ہونے کے بعد چھوٹے ہوئے روزے رکھ کر روزوں کی تعداد مکمل کر لے۔

آیت کے آخیر میں کہا گیا کہ ”اللہ نے جو تمہیں ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو اور تا کہ تم اس کے شکر گزار بنو“۔ یقیناً آپ کو اللہ کی بڑائی بیان کرنی چاہیے اور اس فضل و کرم پر اس کا شکر بجا لانا چاہیے جو اس نے ہمیں اپنی رحمت کے طور پر عطا فرمایا ہے۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ شکر گزاری کے عمل کا تذکرہ 'شکر' کی اصطلاح کے ساتھ ہوا ہے، جب کہ اللہ کی بڑائی بیان کرنے کی بات پوری گفتگو کے خلاصہ کے طور پر آئی ہے۔ الفاظ میں یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ اللہ کی عبادت (روزہ) کسی نہ کسی درجہ میں اللہ کی بڑائی ہی کا اعلان ہے، لیکن شکر گزاری، جس سے مراد اللہ کے فضل و کرم کو صحیح مقام پر استعمال کرنا، اور روزوں کے اثرات اور عملی دشواریوں سے فائدہ اٹھانا ہے، کی چند شرائط ہیں اور جب تک یہ شرائط پوری نہ ہوں، شکر گزاری نہیں ہو سکتی۔ ان شرائط میں سب سے اہم ہیں: غایت درجہ کا اخلاص، روزوں کی حقیقت کا ادراک اور روزے رکھنے کے فلسفہ کا عرفان۔

بہر حال روزے رکھنا ہر مذہب کی شریعت کا حصہ رہا ہے، اگرچہ کہ ان کی شکل مختلف رہی ہو۔ پانچ وقت کی فرض نمازوں کے بعد روزوں کی ہی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ایمان پر عمل درآمد کے لیے روزوں کی حیثیت بنیادی حکم کی ہے۔ روزے رکھنے کا حکم محمد ﷺ اور ان سے پہلے گزرے تمام انبیاء کرام کی روایت رہی ہے۔

یہ بات بھی نوٹ کی جانی چاہیے کہ اسلام میں روزے نفسانی خواہشات کی تربیت اور برائی سے اجتناب کے لیے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو محض کھانے پینے سے روک لینے کا نام نہیں بلکہ تمام برائیوں سے دور رہنے اور اجتناب کا نام ہے۔ کھانے پینے سے رکنے کا حکم انسان کے اندر یہ احساس پیدا کرنے کے لیے ہے کہ جب حلال چیزوں سے رکنا اتنا اہم ہے تو ان چیزوں سے بعض رہنا کس قدر اہم ہوگا جو حرام قرار دی گئی ہیں۔ اسلام میں ایک ماہ کے مسلسل روزوں کا مقصد انسان کے رویوں اور کردار کی تربیت اور روح انسانی کو تجلیات الٰہی سے روشن کرنا ہے۔ روزہ مومنوں کی مدد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو برائی کے مقابلے میں صحیح رہنمائی کریں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مومنوں کو جسمانی سختیاں برداشت کرنے، اپنے نفس پر قابو رکھنے، مزاحمت کرنے اور استقلال و تحمل کا عادی بناتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جس کے لیے ایک مومن کو اپنے ایمان اور دوسرے مومنین کا دفاع کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔

Dr. Syed Rizvi,
Author, Islamic Wisdom,
www.islamicwisdom.net

رمضان میں نقصان اٹھانے والے لوگ

انس شاکر

رمضان المبارک جہاں اک طرف لوگوں کے لئے ہدایت، مغفرت اور رحمت کا مہینہ ہے، وہیں بعض افراد کے لئے وہ خسارے اور نقصان کا مہینہ بھی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بدقسمت ہے وہ شخص جس نے رمضان کا مہینہ پایا اور اپنی مغفرت نہ کرا سکا۔'' (ترمذی)۔ اسی طرح ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ''مسلمانوں کے لیے رمضان سے زیادہ بابرکت مہینہ کوئی نہیں ہوتا، اور منافقین کے لیے رمضان سے زیادہ برا مہینہ کوئی نہیں ہوتا۔ کیونکہ مومنین اس ماہ میں عبادت کے لئے کمربستہ ہوتے ہیں اور منافقین لوگوں کی غیبت اور ان کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ رمضان مومن کے لیے خزانہ اور فاجر کے لیے لعنت ہے۔

رمضان میں نقصان اٹھانے والے لوگ

1۔ جو لوگ ایمان اور احتساب کے ساتھ روزہ نہیں رکھتے بلکہ دکھاوے کے لیے یا بطور عادت روزہ رکھتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس نے رمضان کے روزے ایمان اور احتساب کے ساتھ رکھے اس کے پچھلے گناہ معاف کردئے جائیں گے۔'' اس حدیث کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ اگر ایمان اور احتساب کے ساتھ روزے نہ رکھے گئے تو اس کے پچھلے گناہ معاف نہیں کئے جائیں گے، اور اگر رمضان میں نہیں بخشے گئے تو کب بخشے جائیں گے؟

2۔ جو قیام لیل کو سستی کی وجہ سے یا بوجھ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں، گناہوں کی مغفرت میں ان کا بھی کوئی حصہ نہیں ہے۔

3۔ جو برے اخلاق پر قائم رہتے ہیں، اور ان کا روزہ انہیں محرمات سے نہیں روکتا۔ اس سلسلے میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: ''جس نے جہالت کو اور جھوٹی بات کہنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑا، تو اللہ کو اس کے کھانا پینا چھوڑ دینے کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔'' (بخاری)

4۔ جو اپنا وقت سونے میں، غفلت میں، ٹی وی کے سامنے، گانے سنتے ہوئے برباد کرتے ہیں اور ان چیزوں کو دیکھتے ہیں جن سے ان کا رب غصہ ہوتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اکثر روزہ رکھنے والوں کے حصہ میں صرف بھوک اور پیاس آتی ہے۔'' (احمد، ابن ماجہ)

5۔ وہ لوگ جو نمازوں کو ضائع کرتے ہیں، اور باجماعت نماز اور جمعہ میں بھی مساجد سے دوری اختیار کرتے ہیں۔

6۔ جو عمداً (جان بوجھ کر بغیر کسی مناسب وجہ کے) اپنے روزے کو حسی مفسدات جیسے جماع، کھانا، پینا اور خود لذتی وغیرہ یا معنوی مفسدات جیسے جھوٹ، غیبت، چغل خوری، حسد، مزاح، استہزاء، بے حیائی اور تبرج وغیرہ کے ذریعہ خراب کرتے ہیں۔

7۔ جو دوسری جگہ جا کر آزادی سے اللہ کی نافرمانی کرنے کے لئے سفر کرتے ہیں، اگر ان کو اس ماہ کی برکت اور اچھائی کے متعلق علم ہوتا تو وہ اپنے ہی شہر میں رہ کر روزے رکھتے اور نمازیں ادا کرتے اور اس مبارک مہینہ کے دن اور رات کو غنیمت سمجھتے۔

8۔ جو لوگ ابتدائے مہینہ میں تو محنت کرتے ہیں، توبہ اور استقامت کی نیت کرتے ہیں اور پھر ان کے ارادے پست ہونے لگتے ہیں اور وہ اپنی پچھلی روش پر لوٹ آتے ہیں اور پھر وہی غفلت اور ضیاع کی زندگی دوبارہ شروع کردیتے ہیں۔

9۔ جو اللہ کی کتاب کو چھوڑے رکھتے ہیں۔ نہ اس کی تلاوت کرتے ہیں اور نہ اس پر غور وفکر ہی کرتے ہیں، اور نہ اس کا درس کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''وہ قرآن پر غور وفکر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟'' (سورہ محمد)

10۔ جو اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں، نہ وہ بھوکوں کو کھلاتے ہیں، نہ روزہ داروں کو افطار کراتے ہیں، نہ کسی برہنہ کو لباس پہناتے ہیں اور نہ خیر کے کسی کام میں حصہ لیتے ہیں۔ (ایضا سورہ محمد)

ANAS SHAKIR
RMGP, New Delhi

قرآن، اقامت دین اور مولانا مودودیؒ

پروفیسر خورشید احمد

تجدید واحیاے دین، اسلامی تاریخ کی ایک روشن روایت اور عقیدہ ختم نبوت کا فطری نتیجہ اور دین اسلام کے مکمل ہونے کا تقاضا ہے۔ ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ برگزیدہ بندوں کو اس توفیق سے نوازا کہ وہ دین کی بنیادی دعوت پر مبنی اللہ کے پیغام کو، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدینؓ کے نمونے کی روشنی میں، اپنے دور کے حالات کا جائزہ لے کر بلاکم وکاست پیش کریں۔ دورِ حاضر میں جن عظیم ہستیوں کو یہ سعادت حاصل ہوئی، ان میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979) کا نام سرفہرست ہے۔

ویسے تو مسلم تاریخ کے ہر دور میں نشیب وفراز نظر آتا ہے، لیکن 19 ویں صدی عیسوی اس اعتبار سے بڑی منفرد ہے کہ ساڑھے چودہ سو سال کی تاریخ میں پہلی بار مسلمان ایک عالمی قوت کی شناخت اور حیثیت سے محروم ہوئے۔ اس دوران چار کمزور ممالک اور نام نہاد حکومتوں کو چھوڑ کر پورا عالمِ اسلام مغرب کی توسیع پسندانہ اور سامراجی قوتوں کے زیر تسلط آ گیا۔ یہ صورتِ حال 20 ویں صدی کے وسط تک جاری رہی۔ اس بات میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ یہ دور مسلم تاریخ کا تاریک ترین دور تھا، جو فکری و نظریاتی اور اخلاقی انحطاط کے ساتھ ساتھ معاشی، سیاسی اور تہذیبی، گویا ہر اعتبار سے اُمت کی محکومی کا دور تھا۔

پھر اسی دور میں، کسی نہ کسی پہلو سے تجدید واحیاے دین کی خدمت انجام دینے والی عظیم شخصیات میں جمال الدین افغانیؒ، مفتی محمد عبدہٗؒ، ابوالکلام آزادؒ، سیّد رشید رضاؒ، حسن البناؒ، علامہ محمد اقبالؒ، سعید نورسیؒ، سیّد قطبؒ، سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مالک بن نبیؒ جیسے نمایاں ترین رجال شامل ہیں۔ ان سب کی سوچ کا دھارا، کئی اُمور اور معاملات میں اختلاف کے باوجود، مقصد اور ہدف کے اعتبار سے ایک جیسا تھا، اور وہ یہ تھا: اللہ کے دین کو اس کی اصل شکل میں پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس دین کے مطابق اپنی اور انسانی زندگی کی تشکیل نو اور تعمیر نو کی دعوت دی جائے۔ اللہ تعالیٰ ان سب محسنوں پر اپنی رحمت کی بارش فرمائے، اور ان کی اور ان کے رفقاے کار کی کاوشوں کو قبولیت اور فروغ عطا فرمائے۔ یہی ہیں وہ رہنما کہ جن کی مساعیِ جمیلہ کے نتیجے میں، اللہ تعالیٰ کے فضل خاص سے تاریخ نے کروٹ لی اور محکومی کی تاریک اور طویل رات ختم ہوئی۔ اسلام ایک بھرپور دعوت، انقلابی قوت اور ہمہ پہلو پیغام کی حیثیت سے ایک بار پھر اپنا کردار ادا کرنے کی طرف رواں دواں ہے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے 1920 سے صحافت اور علم و ادب کے میدان میں گراں قدر خدمات کا آغاز کیا۔ 24 برس کی عمر میں انہوں نے الجہاد فی الاسلام جیسی معرکہ آرا کتاب لکھی، جو 1930 میں برعظیم میں علمی تحقیق اور اشاعت کے بڑے باوقار ادارے دارالمصنّفین، اعظم گڑھ نے شائع کی۔ اس کتاب کے لیے تحقیق و جستجو مولانا مودودیؒ کے فکری ارتقا میں ایک سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر یہی ہے وہ فیصلہ کن موڑ (turning point) جہاں سے انھوں نے پیغامِ دین کے لیے عزم و ہمت کا عہد کیا اور عملی قدم اُٹھایا۔ 1933 سے ماہ نامہ ترجمان القرآن، حیدرآباد دکن کے ذریعے اسلامی فکر اور دعوت کے نئے چراغ روشن کرتے رہے۔ 1938 میں ادارہ دارالاسلام کی تاسیس کی۔ 26 اگست 1941 کو جماعت اسلامی قائم کی اور اس کے امیر منتخب ہوئے۔ فروری 1942 سے تفہیم القرآن کی تحریر و اشاعت کا آغاز کیا۔ ستمبر 1979 یعنی اپنی وفات تک فکر و رہنمائی کے ہر میدان اور تجدید و احیائے دین اسلام کے بارے میں گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ مولانا مودودیؒ کی زندگی اور ان کی فکر میں سب سے نمایاں چیز اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق اور قرآنِ کریم کو زندگی کے ہر ہر پہلو کے لیے اپنا رہنما بنانا ہے۔

الحمدللہ، 30 برس تک میرا، مولانا مودودیؒ سے ایسا تعلق رہا ہے کہ جس میں وہ میرے استاد، قائد، محسن اور مربی کی حیثیت سے قدم قدم پر رہنمائی سے نوازتے رہے۔ اس مناسبت سے گواہی دیتا ہوں کہ مَیں نے جس چیز کو مولانا کی زندگی میں فکر و عمل کا سرچشمہ اور روشنی و ہدایت کا منبع پایا ہے، وہ قرآن پاک ہے۔ اسی بنا پر مولانا کی زندگی کی اہم ترین متاع جن چیزوں کو قرار دیا جاسکتا ہے، ان میں سب سے پہلی، بنیادی اور مرکزی متاع قرآنِ کریم ہے۔ پھر قرآنِ کریم اور صاحبِ قرآن خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک ہی کی روشنی میں دینِ حق کا تصور ہے، اور تیسری چیز ہے: ان دونوں کا تقاضا دعوت، اصلاح اور اقامتِ دین کی منظم جدوجہد۔ یہی وہ تین میدان ہیں، جن میں مولانا مودودیؒ نے بڑا تاریخ ساز کردار (contribution) ادا کیا ہے۔

قرآن ہی شاہ کلید ہے!

قرآنِ پاک سے مولانا مودودیؒ مرحوم و مغفور کے تعلق کو سمجھنے کے لیے تین چیزیں بڑی اہم اور چشم کشا ہیں:

1946 میں مولانا محمد عمران خاں ندوی صاحب نے غیر منقسم ہندستان کے اٹھارہ اکابر علما، دانش وروں اور رہنماؤں سے دریافت کیا کہ ''آپ کی محسن کتاب کون سی ہے؟'' دیگر افراد نے اپنی اپنی پسندیدہ کتاب کے بارے میں بتایا لیکن ان میں واحد مولانا مودودیؒ تھے، جنھوں نے سب سے مختصر جواب دیا۔ یہ جواب مولانا کی شخصیت اور ان کی پوری زندگی کا غماز ہے اور سب پہ بھاری بھی۔ انھوں نے لکھا: جاہلیت کے زمانے میں، مَیں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ مَیں قدیم و جدید فلسفہ، سائنس، معاشیات، سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اُتار چکا ہوں، مگر جب آنکھیں کھول کر قرآن کو پڑھا تو بہ خدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ تھا، علم کی جڑ اب ہاتھ آئی ہے۔ کانٹ، ہیگل، نٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری ساری عمر جن گتھیوں کو سلجھانے میں اُلجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں، پھر بھی حل نہ کرسکے، ان کو اِس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر یہ غریب اس کتاب سے ناواقف نہ ہوتے تو کیوں اپنی عمریں اس طرح ضائع کرتے؟ میری اصلی محسن بس یہی ایک کتاب ہے۔ اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے۔ حیوان سے انسان بنا دیا، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں، حقیقت اس طرح برملا مجھے دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ انگریزی میں اُس کنجی کو 'شاہ کلید' (Master Key) کہتے ہیں، جس سے ہر قفل کھل جائے۔ سو، میرے لیے یہ قرآن 'شاہ کلید' ہے۔ مسائلِ حیات کے جس قفل پر اسے لگاتا ہوں، وہ کھل جاتا ہے۔ جس خدا نے یہ کتاب بخشی ہے، اس کا شکر ادا کرنے سے میری زبان عاجز ہے۔

قرآن اور اقامتِ دین

مولانا مودودیؒ کے لیے سب سے بڑی دولت اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت، اللہ کی آخری ہدایت یہ کتاب ہی ہے۔ قرآن ہی وہ اَبدی ہدایت ہے، جو خود خالقِ حقیقی نے اپنے بندوں کی رہنمائی اور ان کو زندگی میں کامیابی کا راستہ دکھانے کے لیے عطا فرمائی۔ مولانا مودودیؒ کے نزدیک قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا کتاب اللہ ہونا ہے، یعنی یہ رہنمائی کسی انسان کی طرف سے نہیں ہے۔ اس کا ذریعہ اور وسیلہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اللہ کو جاننے، اللہ سے جوڑنے اور اللہ کی خوش نودی حاصل کرنے کا واحد راستہ قرآن کی ہدایت کو تسلیم کرنا، اور اس کے مطابق اپنی ذات کو اور ساری دنیا کو ڈھالنا ہے۔ اس کے تین پہلو ہیں: پہلا اور سب سے اہم خداشناسی ہے، جس سے ہم اللہ کو پہچان سکتے ہیں اور اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی کو ڈھال سکتے ہیں۔ اس لیے اللہ پر ایمان اور اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی کو ڈھالنا، زندگی کو گزارنا، قرآن سے تعلق کو جوڑنا، اور قرآن کا فہم حاصل کرنا نہایت بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن کا اصل مخاطب انسان ہے اور قرآن کا اصل مقصود تمام انسانوں کی دست گیری ہے۔ جو

اسے قبول کریں، ان کے لیے یہ سراپا ہدایت ہے اور رہنمائی عطا کرتا ہے۔ یہی خداشناسی اسلام کی بنیاد اور اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لیے اصل سہارا اور قوت ہے۔ دوسرا پہلو خودشناسی ہے، یعنی یہ سمجھنا اور جاننا کہ اللہ ہمیں کیسے انسان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے؟ یہ دیکھنا کہ ہمیں کیا کام سونپا گیا ہے، اور کس معیار پر ہمیں کامیابی اور اجر ملے گا؟ اس چیز کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہے 'استخلاف'۔ اس کے لیے فرد کا تزکیہ کرنا، اس کی کردار سازی کرنا اور علم و عمل کے اعتبار سے اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کی زمین پر، اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرے، یعنی تقویٰ کا حصول۔ تیسرا پہلو ہے خلق شناسی۔ اس سے مراد ہے: انسانوں سے، اداروں سے، معاشروں سے، اقوام سے اور کائنات میں خلق کی ہوئی ہر شکل سے قرآن و سنت کی ہدایت کے مطابق ربط و تعلق قائم کر کے معاملہ کرنا، تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو اور دنیا عدل، امن اور احترامِ آدمیت کا گہوارہ بن جائے۔ ان تینوں بنیادوں کو قرآن نے جامع اصطلاح 'اقامتِ دین' میں سمو دیا ہے اور یہی معنی عبادت کے ہیں۔ یہ دوسرا پہلو ہے، قرآنِ کریم سے مولاناؒ کے تعلق کا، جسے انھوں نے بڑی تفصیل سے مختلف اسالیب میں بیان کیا ہے اور وضاحت فرمائی ہے۔

اقامتِ دین کا اہم تقاضا

مولاناؒ نے بتایا ہے کہ قرآن صرف اللہ کی کتاب اور کتابِ ہدایت ہی نہیں بلکہ کتابِ انقلاب ہے۔ جہاں اس کے مخاطب تمام انسان ہیں، وہاں اس کا خاص طور پر خطاب انسانوں کے ایسے گروہ سے ہے، جو اسے قبول کرتا ہے۔ قرآن انہیں رہنمائی فراہم کرتا اور تیار کرتا ہے کہ وہ کس طرح خود کو اور پوری انسانی زندگی کے ہر شعبے اور دائرہ کار کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے دعوت، شہادتِ حق اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا ہے اور ہدف دین کے پیغام کو عام کرنا اور اللہ کی مرضی کو غالب کرنا بتایا ہے۔ اس مقصد کو تفہیم القرآن کے مقدمے میں مولانا مودودیؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: فہم قرآن کی ساری تدبیروں کے باوجود، آدمی قرآن کی رُوح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا، جب تک عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دُنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رُموز حل کر لیے جائیں۔ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر، خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز

یہ دُنیا کے عام تصورِ مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رُموز حل کر لیے جائیں۔ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر، خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔

اُٹھوائی اور وقت کے علَم برادرانِ کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید رُوح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعیِ حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جُو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اُٹھایا اور حامیانِ حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فردِ واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافتِ الٰہیہ کے قیام تک پورے 23 سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی، اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گسل کش مکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکہ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کش مکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں؟ اسے تو پوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں، جب اسے لے کر اُٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے، اُس طرح قدم اُٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے، جو نزولِ قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکّے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحد سے لے کر حُنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے، اور سابقینِ اوّلین سے لے کر مؤلفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا 'سُلوک' ہے، جس کو میں 'سُلوکِ قرآنی' کہتا ہوں۔ اس سُلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اُتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لُغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ

جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی رُوح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بُخل برت جائے۔ پھر اسی کُلیّے کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اُصول وقوانین آدمی کی سمجھ میں اُس وقت تک آ ہی نہیں سکتے، جب تک کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو، اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں۔ (تفہیم القرآن، اوّل، ص 33-35)

اسلام، ایک ہمہ گیر تحریک

قرآن سے اس تعلق کے ساتھ مولاناؒ نے دوسری اہم فکری خدمت (contribution) یہ انجام دی ہے کہ دین اسلام کو آج کی زبان میں، ایک مکمل لائحہ عمل کے طور پر بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے، جس میں دین اور دنیا کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔ ایمان اس کی بنیاد ہے اور عبادت اس کا مظہر بھی ہے اور اس کے تقاضوں کے لائق بنانے کا ذریعہ بھی۔ لیکن اصل ہدف اور مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ ہر شعبہ زندگی کو اللہ کی مرضی کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس میں نجی، خانگی، اجتماعی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، ملکی، عالمی سطح کے تمام تعلقات شامل ہیں۔ اس ضمن میں مولانا مودودیؒ نے بنیادی نوعیت کے چار مزید کام انجام دیے، جو ان کی فکری خدمات میں نمایاں ترین مقام رکھتے ہیں:

اسلامی فکر، بے لاگ جائزہ:

قرآنی بصیرت ورہنمائی کی روشنی میں، انھوں نے مسلم معاشرے اور اُمتِ مسلمہ کی فکر، اس کی تنظیم اور اس کے اجتماعی اہداف پر تنقیدی وتجزیاتی نظر ڈالی۔ جہاں اُن بنیادی وسائل کی قدر، تائید اور پشت پناہی کی جو اسلام کے پیغام اور دعوت کو محفوظ کرنے اور دین کے علم کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے موجود تھے، وہیں اس امر پر گہری تشویش کا اظہار بھی کیا کہ عملاً ہر دور میں اہلِ خیر کی کوششوں کے باوجود ایسی کمزوریاں اور خامیاں دَر آتی رہی ہیں، جو آخر کار مسلمانوں کی کمزوری اور زوال کی راہوں کو ہموار کرنے کا سبب بنیں اور آج بھی اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کے وقار میں اضافے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ مسلم معاشروں میں دین سے عدم واقفیت، اور جاہلیت کی گرفت بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ایک صاحبِ ایمان مسلمان علم، اخلاق اور دیانت کے بغیر کسی بھی میدان میں کام نہیں کر سکتا۔ علوم کی تقسیم دین اور دنیاوی دائروں میں اس حد تک تو گوارا کی جاسکتی ہے کہ مختلف علوم کے دائروں کو متعین کیا جائے، لیکن اسلام کے تصورِ علم میں اللہ کی مرکزیت اور اللہ کی ہدایت کو علم کے ہر شعبے میں مطابقت (relevance) کے ساتھ پیش کرنا اور ہر وقت اس کا احساس بیدار کرنا فہمِ دین کا بنیادی اصول ہے۔ ہمارے دورِ زوال میں شعوری یا غیر شعوری طور پر علم کا تصور محدود تر ہو گیا۔ کم از کم علمی سطح پر دین کے دائروں اور دینی ہدایت کو شخصی زندگی اور عبادات تک محدود کر دیا گیا۔ اجتماعی زندگی اور اجتماعی علوم کے باب میں دینِ حق نے جو رہنمائی فراہم کی ہے اور جو دورِ عروج میں ہماری شان رہی ہے، اس سے ہم بہت دُور ہو گئے ہیں۔ جب تک یہ ترتیب اور مطابقت علوم اور تربیت کا حصہ نہیں بنتی، احیاے اسلام ممکن نہیں ہوگا۔ اس مقصد کے لیے مولانا مودودیؒ نے مسلم معاشروں کی فکری ساخت کا تجزیہ کرتے ہوئے بنیادی مرض کی نشان دہی کی۔

قانون سازی کی بنیاد:

مولانا مودودیؒ نے بتایا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کے سلسلے میں جو ترتیب عطا فرمائی ہے، اس میں روشنی کا بلاشبہہ اصل سرچشمہ قرآنِ پاک ہی ہے۔ لیکن اللہ کی اس مکمل ہدایت کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تک پہنچایا ہے، اس کی تعلیم دی ہے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا نمونہ ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ اس طرح قرآن کے بعد ہدایت کا دوسرا سب سے بنیادی اور مرکزی ذریعہ سنتِ رسولؐ اور سیرتِ پاکؐ ہے۔ اس کے بعد قرآن وسنت کی روشنی میں نئے مسائل حل کرنے کے لیے استدلال، قیاس، استنباط اور اجتہاد کی بنیاد پر قانون سازی ہے۔ یہی ہے وہ عمل کہ جس سے فقہ کا قیمتی سرمایہ وجود میں آیا۔ پھر فقہ کے مطابق عمل کرتے ہوئے علم اور تقلید کی روایت نے سفر شروع کیا۔ مولانا مودودیؒ کے نزدیک احیائے دین کے لیے صحیح ترتیب قرآن، سنت، فقہ اور تاریخ ہے۔ جس کی روشنی میں نئے مسائل کا حل قرآن وسنت اور اجتہاد واستنباط ہے۔ لیکن بدقسمتی سے دورِ زوال میں یہ ترتیب اُلٹ کر رہ گئی۔ یوں تقلید وتاریخ نے عملاً اوّلیت اختیار کر لی، پھر فقہ، اس کے بعد سنتِ رسولؐ، حکایاتِ بزرگانِ دین اور اس کے بعد قرآن۔ گویا کہ جس چیز، یعنی قرآن کو سب سے پہلے ہونا چاہیے تھا، وہ سب سے آخر میں چلا گیا۔ یہی بدقسمتی مسلمانوں میں مروج نظامِ تعلیم کے ساتھ ہوئی اور وہاں پر بھی ترتیب اُلٹ گئی، اور قرآن سب سے آخر میں اور وہ بھی محدود تر دائرے میں شاملِ نصاب ہوا۔ مولانا مودودی نے اس بات کی طرف متوجہ فرمایا کہ مسلم معاشرے میں اصل اصلاح طلب چیز، حقیقی اور مطلوب ترتیب کو بحال کرنا ہے۔ فقہ کو نظرانداز کرنا یا دریابُرد کرنا خودکشی کے مترادف ہے، مگر رہنمائی کے لیے ترتیب میں قرآن، سنت اور پھر فقہ وتاریخ کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یہ ایک انقلابی نکتہ ہے، جسے مولانا مودودیؒ نے ابن تیمیہؒ، امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہؒ سے گاہے اتفاق اور کچھ اختلاف کے ساتھ پیش کیا اور اس جراتِ اظہار کی بڑی قیمت ادا کی۔

مغربی فکر و تہذیب کا محاکمہ:

تیسرا نکتہ ہے مغربی فکر اور مغربی تہذیب کے غلبے سے پیدا شدہ صورتِ حال اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا اسلام سے معاملہ۔ بلاشبہہ مسلمانوں نے اپنی سیاسی اور دینی آزادی کے تحفظ کے لیے استعماری قوتوں کے خلاف جہاد کیا اور اس میدان میں بڑی روشن مثال قائم کی۔ تاہم، جہاد کے محاذ پر کامیاب نہ ہونے کے بعد اہلِ خیر کی ایک بڑی تعداد نے تصادم سے پسپائی کی روش ضرور اختیار کی، مگر اس کا مقصد دینی روایت کا تحفظ اور دینی علوم سے رشتے کو جاری اور مضبوط رکھنا تھا۔ اس محدود حد تک تحفظ دین کی یہ حکمت عملی مفید رہی، لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ ضرور رُونما ہوا کہ اجتماعی زندگی اور اس کی رہنما اقدار سے اسلام بے دخل ہوتا گیا۔ کچھ حلقوں نے مغرب کی مکمل تقلید اور اپنے کو مغرب کے رنگ میں رنگنے کا راستہ اختیار کیا، تو کچھ دوسروں نے عملاً تو مغربی تقلید کی روش اختیار کی، مگر اس کے لیے بہت سی اسلامی اصطلاحات کا سہارا بھی لیا۔ 'اصلاح مذہب' کی تحریکیں مختلف شکلوں میں رُونما ہوئیں، جنھوں نے اصلاح کا کام کم اور دین میں تحریف اور مغرب کی نقالی کا کھیل زیادہ کھیلا۔ اس تہذیبی تبدیلی کو اکبر الٰہ آبادیؒ نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

نہیں اس کی کوئی پرسش کہ یاد اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

اور یہ کہ:

ہم کیا کہیں، احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

مولانا مودودیؒ نے اقبالؒ اور دوسرے علما و مصلحین کے ساتھ مغربی تہذیب کا بھرپور محاکمہ کیا اور بہت صاف صاف الفاظ میں یہ بات کہی کہ: ''مغربی سامراج سے صرف سیاسی آزادی مطلوب نہیں بلکہ فکری، نظریاتی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی آزادی بھی مطلوب ہے، تاکہ مسلمان اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی کو مرتب اور منظم کرسکیں۔ اس مقصد کے لیے محض مسجد بنا دینا اور صرف نماز پڑھ لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے خاندانی نظام کا تحفظ اور اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر بھی ضروری ہے۔ نیز سیاسی آزادی اور اختیار بھی مطلوب ہے تاکہ دینی اقدار بالادست ہوں اور یوں اجتماعی زندگی اسلامی بنیادوں پر استوار ہو''۔ اقبالؒ نے بڑے لطیف انداز میں کہا:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اور یہ کہ:

جدا ہو دیں سیاست سے، تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مولانا مودودیؒ نے اقبالؒ اور دوسرے علما و مصلحین کے ساتھ مغربی تہذیب کا بھرپور محاکمہ کیا اور بہت صاف صاف الفاظ میں یہ بات کہی کہ: ''مغربی سامراج سے صرف سیاسی آزادی مطلوب نہیں بلکہ فکری، نظریاتی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی آزادی بھی مطلوب ہے، تاکہ مسلمان اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی کو مرتب اور منظم کرسکیں۔''

اسلام، درحقیقت سیاسی و تہذیبی اور فکری و سیاسی میدان میں آزادی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ غلامی کی ہر رمز اور محکومی کی ہر علامت کو رَد کرتا ہے، تاکہ اسے قبول کرنے والے زندگی کی تشکیل نو کرسکیں۔ مولانا مودودیؒ نے اس موقف کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ ان کے متوازن ذہن اور محتاط قلم نے مغرب زدگان کو دلیل کے میدان میں بے بس کر دیا ہے اور یہی چیز مغرب کو کھائے جارہی ہے۔ جس کے لیے کبھی اس کے ترجمان 'سیاسی اسلام' جیسی نامعقول، مہمل اور مضحک (absurd) اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور کبھی اسلام کے ڈانڈے فاشزم اور انتہاپسندی سے جوڑتے ہیں۔ حالاں کہ سچ بات یہ ہے کہ مسلمان اپنا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ حق کہ وہ اپنی انفرادی اور اپنی اجتماعی زندگی کو اپنی اقدار و تہذیب اور قانون و ضابطے کے مطابق گزار سکیں۔ جس طرح مولانا مودودیؒ نے مسلم معاشروں کا جائزہ لے کر ان کی خامیوں کو متعین کیا، اسی طرح انھوں نے مغربی تہذیب کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ یہاں بھی انہوں نے اندھی تنقید اور اندھی تقلید دونوں کے مقابلے میں ایک آزاد، نظریاتی، منطقی اور اعتدال پر مبنی رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے تعصب پر مبنی تحقیق و مطالعے کو عدل اور شرفِ انسانی دونوں کے لیے نقصان دہ قرار دیا ہے۔ مولاناؒ نے مغرب اور مغربی تہذیب کو اس کے مآخذ کے مطالعے اور سرچشموں کے مشاہدے سے جاننے کی جستجو کی ہے۔ پھر ان بنیادوں پر تنقید کی ہے، جو خداناشناسی یا خدا کی قدرت کے محدود تصور پر مبنی ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے مغرب کے سامراجی کردار اور نظریاتی و سیاسی پہلوؤں کا ہمہ پہلو محاکمہ کیا ہے۔ پھر مسلم دنیا کو مغرب کے اس اثر سے نکالنے کے لیے سیاسی، فکری، اجتماعی جدوجہد کی دعوت دی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ مغرب میں یا مغرب کی ہر چیز غلط نہیں، اور نہ مشرق میں اور مشرق کی ہر چیز خیر ہے۔ ہمیں کھلے ذہن اور کھلی آنکھوں سے دیکھنا چاہیے کہ 'خیر' کے لیے کس چیز سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اس ضمن میں انسانی زندگی کے معاملات، سیاسی تجربات اور سائنسی

علوم کو ایک صاحبِ ایمان فرد کی حیثیت سے پرکھنا چاہیے کہ کہاں اور کس قدر خیر ہے، خیر کو شر سے چھانٹ کر انسانی زندگی کا حصہ بنانا چاہیے اور شر سے انسانیت کو بچانا چاہیے۔ یہ حس اور یہ صلاحیت اس کھلے ذہن سے پیدا ہو سکتی ہے کہ جس کی میزان لازمی طور پر اسلامی ایمانیات پر استوار ہو اور جس کی کسوٹی اسلامی اصولوں کے ساتھ تصادم یا مطابقت کے سوال سے مشروط ہو۔ جو چیز اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہیں، وہ انسانیت کی میراث ہے۔ البتہ اندھی تقلید اور اندھی تنقید غلط چیز ہے۔ جو اچھا ہے، اسے قبول کر لو اور جو بُرا ہے، اسے مسترد کر دو۔ خیر تک رسائی اور خیر کے استعمال و اختیار کے لیے پوری دنیا ایک میدان ہے۔ ایک صاحبِ ایمان فرد کسی ایک علاقے اور کسی ایک زمانے تک محدود نہیں رہ سکتا۔ اسے معتدل طریقے سے یہ خدمت انجام دینی چاہیے۔

مسلم اور مغربی معاشروں کے تنقیدی جائزے کے بعد مولاناؒ نے بتایا ہے کہ اسلامی احیا ہی انسانی زندگی کے لیے خیر اور فلاح کا سرچشمہ ہے، جس کا ماخذ قرآن ہے۔ قرآن کی بنیاد پر دین کو سمجھا جائے، قرآن کی حکمت عملی کو سمجھا جائے اور قرآن کے زیر سایہ اسلامی احیا کی تحریک کو منظم کیا جائے۔ یہ کام دعوت اور نظم و ضبط سے، افراد کی تیاری اور اداروں کی تعمیر و ترقی ہی سے ممکن ہے، جس میں سب سے مرکزی اور بنیادی ادارہ خاندان ہے۔ مولانا محترم نے زور دے کر بتایا ہے کہ جدید دور میں، جدید ذرائع اور جدید اسلوب کو دعوت و تنظیم اور عمومی بیداری کا ذریعہ بنانا چاہیے۔ اسی لیے انھوں نے جدید زمانے میں تنظیم سازی کے لیے بہترین انداز سے جماعت اسلامی اور دوسرے دعوتی اداروں کو منظم کیا۔

تبدیلی کا اسلامی راستہ

چوتھا یہ کہ مولانا مودودیؒ نے صرف دین ہی کا جامع تصور نہیں دیا، بلکہ عملاً یہ بھی بتایا کہ اسلامی نظام کے خدوخال کیا ہوں گے؟ تبدیلی کا عمل اور تدریج کیا ہوگی؟ انھوں نے جہاد اور قتال کے بارے میں معذرت خواہی یا مداہنت نہیں برتی بلکہ اس کی حدود کو واضح کیا ہے۔ آج کے معاشرے، ریاست اور قانون کو اسلامی شریعت سے قریب تر لانے کے لیے اجتہادی اُمور کی جانب متوجہ کیا ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ آج ریاست کو کیسے چلانا ہے؟ دستور کس طرح بنانا ہے؟ اسلامی خاندان اور مسلم معاشرے کی وسیع بنیادیں کیا ہیں؟ مسلم اکثریتی علاقوں میں کس طرح زندگی بسر کرنی ہے؟ مسلم اقلیتی ممالک میں زندگی کو کس طرح برتنا ہے؟ انسانی معاشرہ مجموعی طور پر کن بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے یا اس کیا اصول کیا ہونے چاہییں؟ خاص طور پر سیاست، معیشت اور تعلیم کے میدان میں بہت ہی متعین انداز میں رہنمائی دی اور درست سمت بتائی ہے۔ اس پورے علمی و فکری سفر میں مولانا مودودیؒ کے ہاں ارتقا ہے، تضاد نہیں۔ انھوں نے اجتہاد اور علم کی بنیاد پر کئی نئے راستے کھولے ہیں اور کئی شاہراہوں کی نشان دہی کی ہے۔

مولانا مودودیؒ نے یہ بھی بتایا ہے کہ قومی ریاستیں (Nation States) مسلمانوں کی منزل نہیں، البتہ مسلم ممالک اور دنیا کے حالات کی روشنی میں وہ مسلم اُمہ کے اتحاد و اشتراک کی جانب رواں سفر کا ایک ذریعہ بن سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ نظریاتی اساس پر اپنی تعمیر کریں۔ ہماری قومی ریاستیں مغرب کی طرح علاقائی اور جغرافیائی اکائیاں نہیں ہیں، بلکہ ایک نظریے کی علَم بردار اور ایک جسدِ واحد کا حصہ ہیں، جنھیں ایک جان دار جسم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی ہے وہ سبق، جو قرآنِ کریم نے ہر مسلمان کو پڑھایا اور سمجھایا ہے۔

اس حوالے سے مولانا مودودیؒ کی فکر کو سمجھنے کے لیے بنیادی نکات دو ہیں: قرآن اور اقامت دین۔ ان کا سارا علمِ کلام اس کی تفسیر ہے اور ان کی تمام سرگذشتِ زندگی انھی کے مدار میں رواں رہتی اور پھلتی پھولتی ہے۔

ایک اہم بات جس کا ادراک بہت ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے ایک طرف قرآن و سنت اور تاریخ تجدید و احیا کے گہرے مطالعے اور تجزیے کی روشنی میں اسلام کے تصورِ حیات کو اس کی مکمل شکل میں پیش کیا۔ ایمان اور تزکیے کے ساتھ زندگی کے پورے نظام کی اسی بنیاد پر تعمیر و تشکیل کا واضح تصور اور نقشہ پیش کیا۔ پھر اس کے مطابق زندگی کے نقشے کو بدلنے کے لیے دعوت اور منظم تحریک کی ضرورت اور حکمت کو واضح کیا، وہیں سوچ کا ایک انداز، تحقیق کا ایک اسلوب اور افکار اور حکمت عملی کی تشکیل کے لیے قرآن و سنت کی روشنی میں خطوطِ کار مرتب کیے، جسے مَیں مولانا مودودیؒ کا منہج (methodlogy) کہتا ہوں۔ اس عمل میں انھوں نے قرآن و سنت سے مکمل وفاداری پر زور دیا ہے۔ تاریخی روایت کے تسلسل کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات اور زمانے کے تقاضوں کا ادراک کرنے اور اُن کی روشنی میں حدود اللہ کی پاس داری اور مقاصدِ شریعت سے وفاداری کو لازم قرار دیا ہے۔ پھر زبان و بیان، دلیل و استدلال، تنظیم اور نظامِ کار اور پالیسی کے میدان میں نئے تجربات کی ضرورت اور حدود کو بھی معین فرمایا۔ ان اُمور کی روشنی میں مسلمانوں کی اپنی تاریخ اور دورِ حاضر کی غالب تہذیب دونوں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا اور نئے تجربات کیے۔

مولانا محترم کے اندازِ فکر اور تحقیق و تجزیے کے اسلوب، دونوں میں ہمارے لیے بہترین رہنمائی ہے۔ مسلمانوں کو عہدِ حاضر میں تجدید و احیائے دین کے لیے سرگرم اور متحرک کرنے پر اللہ تعالیٰ انھیں بہترین انعامات سے نوازے، آمین۔

Prof.Khurshid Ahmad (Leicester,UK)
King Faisal International Prize
for Science, Saudi Arabia
Nishan-e-Imtiaz, Pakistan

سکھ مت اور اسلام

محمد ندیم

قسط دوم

اسلام اور سکھ مت میں اتفاق

(1) جس طرح اسلام خدائے واحد کو اس کائنات اور اس کی جملہ اشیاء کا خالق مانتا ہے، اسی طرح سکھ مت بھی خدائے واحد کو تمام اشیاء کا خالق مانتا ہے، اور ذاتِ باری کو ان تمام صفات سے متصف قرار دیتا ہے جن سے اسلام اسے متصف قرار دیتا ہے۔ ڈاکٹر گوپال چند سنگھ گروگرنتھ صاحب کے ترجمہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ''وہ ازلی خالق اور محیط ہے، حسد ونفرت سے دور اور علت العلل ہے، جملہ مخلوقات کا معبود، عادل، رحیم اور کریم ہے۔ اس نے انسانوں کو ان کے گناہوں پر سزا دینے کے لئے نہیں بلکہ اپنی عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے۔'' اسلام نے بھی خدا کو ان جملہ صفات سے متصف قرار دیا ہے۔

(2) سکھ مت میں نجات کا دارومدار بندگی رب اور اس کے طریقے کی پیروی ہے۔ اسلام میں بھی نجات کا دارومدار بندگی رب اور اس کے بتائے ہوئے طریقے کی پیروی پر ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم لوگ اس کے علاوہ کسی اور کی بندگی نہ کرو۔'' دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اس بہتر شریعت کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی جانب سے نازل کی گئی ہے۔''

(3) سکھ مت رہبانیت کو حرام قرار دیتا ہے اور سماج میں رہتے ہوئے خدا کو یاد رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام بھی رہبانیت کا سخت مخالف ہے۔ ایک مشہور حدیث میں اسلام کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لا رھبانیۃ فی الاسلام'' (ترجمہ: اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔)

(4) سکھ مت لوگوں کو حلال رزق کی تلاش پر آمادہ کرتا ہے اور اس کی سخت تاکید کرتا ہے۔ اسلام نے بھی حلال رزق کمانے پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''بس جب نماز ختم ہو جائے تو تم لوگ زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا رزق تلاش کرو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

(5) سکھ مت میں تمام انسان مساوی ہیں۔ کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ خدا کا دین تمام انسانوں کے لئے ہے۔ جو بھی اس کی شریعت کی پیروی کرے گا نجات پائے گا۔ اسلام بھی پوری انسانیت کو برابر قرار دیتا ہے۔ یہ دین بھی کسی خاص گروہ کا دین نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ جو شخص اس دین کی پیروی کرے گا وہ نجات حاصل کر سکے گا۔ اس کے نزدیک کالا، گورا، امیر، غریب ہر ایک خدا کی عبادت کے ذریعہ نجات پا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہیں مختلف قبیلوں اور خاندانوں میں بانٹ دیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، یقیناً خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہے۔''

(6) اسلام کی طرح سکھ مت بھی یہ تصور رکھتا ہے کہ خدا کا دین جملہ اقوام کے لئے ہے، کسی خاص گروہ کو خدا کے یہاں مخصوص مقام حاصل نہیں اور نہ ہی مذہبی رسوم کی ادائیگی کسی خاص طبقہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ گوپال چند سنگھ گروگرنتھ صاحب کے مقدمہ میں ذاتِ باری پر سکھ مت کے اعتقاد کو یوں بیان کرتے ہیں: ''وہ کسی مخصوص فرقہ کا نہیں بلکہ سب کا خدا ہے۔ عادل، رحیم اور کریم ہے۔ اس نے انسانوں کو ان کے گناہوں پر عذاب دینے کے لئے نہیں بلکہ ایک عظیم مقصد یعنی اپنی بندگی کے لئے پیدا فرمایا ہے۔'' قرآن مجید میں ہے: ''اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں کو پیدا فرمایا ہے شاید تمہارے اندر خدا ترسی پیدا ہو۔''

(7) دونوں مذاہب میں عشر کا نظام پایا جاتا ہے۔

(8) دونوں مذاہب میں مرکزی عبادت گاہ کا تصور موجود ہے۔ سکھوں کی مرکزی عبادت گاہ 'ہری مندر' ہے، جس کی زیارت اور امرتسر کے تالاب میں غسل سے جملہ گناہ مٹ جاتے ہیں۔ اسلام میں مرکزی عبادت گاہ 'خانہ کعبہ' ہے۔ اور متعدد احادیث نبوی میں حج مقبول کا ثواب جملہ گناہوں سے انسان کا پاک ہونا بتایا گیا ہے۔

(9) سکھ مت ستی کی رسم کی مخالفت کرتا ہے، نیز بیواؤں کی شادی پر بھی زور دیتا

ہے۔دوسری طرف اسلام میں بھی ستی کی رسم کا کوئی تصور نہیں ہے اور وہ بیواؤں کی شادی کی تاکید کرتا ہے۔

(10)سکھ مت بت پرستی کا شدید مخالف رہا ہے۔اسلام نے بھی بت پرستی کو حرام قرار دیا ہے۔

اسلام اور سکھ مت میں اختلافات

(1)اسلام کے نزدیک انسان کا مقصدِ زندگی رضائے الٰہی ہے۔قرآن کریم میں ہے: "وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ"۔یعنی مومن اپنے اوپر کسی کے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنے بلند و برتر رب کی رضا کے حصول کی نیت کی وجہ سے اپنے رب کے حضور انعام و اکرام کا مستحق ہوگا۔سکھ مت میں زندگی کا مقصد 'نروان' (یعنی انسان کی روح کا جسم سے نکل کر برہما کی ذات میں جاملنا) ہے۔

(2)سکھ مت عقیدہ حلول و اتحاد کا قائل ہے جبکہ اسلام اس عقیدہ کا سخت مخالف ہے۔

(3)اسلام میں ذبیحہ جائز ہے جبکہ سکھ مت میں ممنوع ہے۔

(4)اسلام میں ختنہ مشروع ہے جبکہ سکھ مت میں ممنوع ہے۔

(5)بغل اور زیر ناف بالوں کی صفائی اسلام میں مسنون ہے جبکہ سکھ مت میں جسم کے کسی بھی مقام کے بالوں کا نہ کاٹنا مستحب ہے۔

(6)پانچ ککار (1) کیش (بال)، (2) کنگھا (3) کڑا، (4) کرپان (خنجر) اور (5) کچھیرا (کچھا) سکھ مت میں لازمی ہے، جبکہ اسلام میں اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

(7)سکھ مت میں اصل گرو خدا ہے، اس کے علاوہ خدا جسے بھیجتا ہے اسے بھی گرو کہا جاتا کیونکہ وہ خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچاتا ہے۔جب کہ اسلام میں ایسا نہیں ہے۔اسلام میں خدا کو اللہ، رب، رحمن، اور رحیم وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں جبکہ اس کی جانب سے بھیجے ہوئے لوگوں کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔

ہری مندر

تیسرے گرو امر داس نے گرو نانک صاحب کی زندگی سے وابستہ ایک مقام کو، جہاں قدرتی پانی کا ایک چشمہ تھا، اکبر بادشاہ سے خرید کر کے وہاں ایک شہر کی بنیاد رکھی اور اس چشمہ کو ایک بڑے تالاب کی شکل میں بنوادیا بعد میں یہ تالاب امرت سر (چشمہ آبِ حیات) کے نام سے مشہور ہوا اور شہر کا بھی یہی نام پڑ گیا۔اس کے بعد پانچویں گرو ارجن دیو نے اس تالاب میں سکھوں کے لئے ایک مرکزی عبادت گاہ 'ہری مندر' کی تعمیر کرائی۔یہ سکھوں کی سب سے اہم اور مقدس عبادت گاہ ہے۔اس مقام پر سکھ گروؤں کی مستقل رہائش اور ان کی ذات میں 'میری' اور 'فقیری' (سیاست اور مذہب) کے امتزاج کے باعث یہ جگہ سکھوں میں 'دربار صاحب' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔اس کی زیارت اور یہاں غسل گناہوں سے مغفرت کا ذریعہ ہیں۔

گرو گرنتھ صاحب

گرو انگد نے گرو نانک اور دوسرے ہندو مسلم صوفی سنتوں کے اشعار کو جمع کر کے ایک کتاب مدون کی تھی، جسے 'پوتھی' کہا جاتا تھا۔پھر اس کے بعد گرو ارجن دیو نے سابقہ تمام گروؤں، صوفی سنتوں اور اپنے کلام جمع کر کے 1604 میں 'آدی گرنتھ' کے نام سے کتاب مدون کی۔آدی گرنتھ کا دوسرا اور آخری خاکہ گرو گوبند سنگھ کے ہاتھوں تکمیل پایا۔انہوں نے سابقہ کلام کے ساتھ آدی گرنتھ میں اپنے والد گرو تیغ بہادر کے کلام بھی شامل کر کے اسے قطعی شکل دے دی اور یہی نسخہ آج سکھوں کے نزدیک صحیح اور مستند سمجھا جاتا ہے۔اپنی وفات کے وقت گرو گوبند سنگھ نے اپنے متبعین کو یہ نصیحت کی تھی کہ ان کے بعد گروؤں کا سلسلہ ختم ہونے والا ہے اور اب 'آدی گرنتھ صاحب' ہی کو اپنا گرو سمجھیں۔اسی وقت سے آدی گرنتھ صاحب سکھوں کے لئے نہ صرف مقدس قرار دیا گیا بلکہ اس کا احترام سکھ مت کی ایمانیات میں شامل ہو گیا۔

خاتمہ

مطالعہ ادیان کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم مختلف مذاہب کے بارے میں جانیں۔ان کے نظریات و عقائد پر نظر رکھیں اور مدعو کی ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے ان تک اسلام کی دعوت پہنچائیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری ہم پر عائد کی ہے اسے بخوبی انجام دیں۔

اس مضمون میں ہم نے سکھ مت کا مطالعہ کیا اور اس کی بنیادی تعلیمات اور خصوصیات کے بارے میں جانا۔اس کے علاوہ اسلام اور سکھ مت کے درمیان مشترک چیزوں اور ان کے درمیان کے اختلافات کا بھی جائزہ لیا۔یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ دعوت پیش کرتے وقت مدعو کی ذہنیت اور حالات کا پورا خیال رکھنا چاہئے۔قرآن کے بتائے ہوئے طریقے (حکمت، موعظت اور جدال احسن) اور انبیائے اکرام کے اسوہ کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھنا چاہئے۔(ختم شد)

(نوٹ: اس مقالے کے آخر میں مصنف موصوف نے اپنے ہر دعوی کے حق میں حوالہ جات بھی درج فرمائے تھے۔رفیق میں قلت صفحات کے سبب انہیں حذف کر دیا گیا ہے۔حوالہ جات کے لیے مصنف یا ادارہ رفیق سے براہ راست رجوع کیا جا سکتا ہے۔)

Mohammed Nadeem
Faculty, AL Jamia Al Islamiya,
Santhapuram, Kerala.

مزاج کی بے اعتدالی!

محمد آصف اقبال، نئی دہلی

اعتدال ایک ایسا طرز عمل ہے جس کے نتیجہ میں ہمیشہ خیر کا پہلو نمایاں رہتا ہے۔اس کے برخلاف بے اعتدالی ہر اعتبار سے فرد، ملت اور معاشرہ کو بگاڑ کی جانب گامزن کرتی ہے۔ایسا شخص جو اعتدال سے تجاوز کرتا ہو اور میانہ روی اس کی پہچان نہ ہو دنیا میں کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتا۔ایک معتدل مزاج شخص ہر وہ ہدف حاصل کرسکتا ہے جس کی تمنا وہ اپنے دل میں لیے ہوئے ہے، جسے وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔مزاج کی بے اعتدالی دراصل فکر و نظر کے کمزور ہونے اور حقائق کی گہرائی یا گیرائی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔جس کے سبب انسان اندرون خانہ و بیرون زمانہ اپنے آپ کو اکیلا سمجھنے لگتا ہے، وہ ہر آزمائش کو بطور چیلنج قبول کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ تھک ہار کر ان بڑے مقاصد کو چھوڑ بیٹھتا ہے، جنہیں وہ کبھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔دوسری جانب انتہا پسندانہ اسکیمیں جو انتہا پسندانہ طریقوں سے چلائی جاتی ہیں، عام انسانوں میں اثر پذیری کے اعتبار سے ناکام ثابت ہوتی ہیں۔لہذا عام انسان ان طریقوں سے کراہیت محسوس کرتا ہے اور جو لوگ اس طریقہ کو اختیار کرتے ہیں۔ابتدا میں ضرورت سے زیادہ جوش و جذبہ میں ہر تنقید کو آزمائش سمجھتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ناکامی کے سبب ان میں مایوسی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ معاشرہ میں کوئی بڑا کردار ادا کرنے کے لائق نہیں رہتے۔ان سب کی بنیادی وجہ فکر و نظر اور اعمال و طریقہ کار کا یک رخا پن ہے۔اس کیفیت میں مبتلا ہو کر متذکرہ افراد و گروہ کو تصویر کا ایک ہی رخ نظر آتا ہے اور وہ دوسرے رخ کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔انتہا یہ ہوتی ہے کہ ضرورت سے زیادہ فرد و گروہ اپنے نقطہ نظر کے علاوہ کسی دوسرے کو اہمیت نہیں دیتا، اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کے لیے راضی نہیں ہوتا، ضرورت سے زیادہ اپنی بات پر اصرار کرتا ہے، اختلاف رائے کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ دوسروں کی نیتوں پر شکوک و شبہات کرنا عام بات ہو جاتی ہے، کشمکش، دھڑے بندی شروع ہو جاتی ہے اور صلاحیت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔اس پس منظر میں بے اعتدالی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اعتدال کے معنی و مفہوم سمجھیں جائیں۔اس پر اپنے شب و روز کے اعمال کو قائم کیا جائے۔قرآن و سنت میں بہت سی ایسی آیات و احادیث ہیں جو اسلام کی وسطیت اور اس کے افراط و تفریط سے پاک متوازن و معتدل ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ایسی وسطیت جس میں کوئی انحراف و کجی نہیں ہے۔بحیثیت مسلمان ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم غلو و تقصیر اور افراط و تفریط سے پاک زندگی بسر کریں۔نہ اس میں انتہا پسندی ہو اور نہ سستی و کاہلی ہی۔

سورہ لقمن میں حضرت لقمٰن اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''بیٹا، کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اُسے نکال لائے گا، وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔بیٹا، نماز قائم کرنے کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں

کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اور اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔'' (سورہ لقمٰن :16-19)۔ یہ تمام صفات بندہ مومن کے اندراسی وقت پیدا ہوسکتی ہیں جبکہ اس ہر عمل میں توازن موجود ہو۔ قرآن کی ہر آیت اللہ رب العزت کی بطور ہدایت فراہم کردہ آیت ہے۔ جسے مسلمانوں کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان آیات کے آخر میں ''چال میں اعتدال'' پیدا کرنے کی نصیحت وہدایت کی گئی ہے، جسے سمجھنا ضروری ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ ''تیز بھی نہ چل اور آہستہ بھی نہ چل، بلکہ میانہ روی اختیار کر۔'' لیکن سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رفتار کی تیزی وسستی زیر بحث نہیں ہے۔ آہستہ چلنا یا تیز چلنا اپنے اندر کوئی اخلاقی حسن وقبح نہیں رکھتا اور نہ اس کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔ آدمی کو جلدی کا کوئی کام ہو تو تیز کیوں نہ چلے؟ اور اگر وہ محض تفریحاً چل رہا ہو تو آخر آہستہ چلنے میں کیا قباحت ہے۔ میانہ روی کا اگر کوئی معیار ہو بھی تو ہر حالت میں ہر شخص کے لیے اسے ایک قاعدہ کلّیہ کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ دراصل جو چیز یہاں مقصود ہے وہ تو نفس کی اُس کیفیت کی اصلاح ہے جس کے اثر سے چال میں تبختر اور مسکینی کا ظہور ہوتا ہے۔ بڑائی کا گھمنڈ انسان کے اندر موجود ہو تو وہ لازماً ایک خاص طرز کی چال میں ڈھل کر ظاہر ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کر یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ آدمی کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے۔ بلکہ چال کی شان یہ تک بتادیتی ہے کہ کس گھمنڈ میں مبتلا ہے۔ دولت، اقتدار، حسن، علم، طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں بھی انسان کے اندر تکبُّر پیدا کرتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اس کی چال کا ایک مخصوص ٹائپ پیدا کردیتا ہے۔ اس کے برعکس چال میں مسکینی کا ظہور بھی کسی نہ کسی مذموم نفسی کیفیت کے اثر سے ہوتا ہے۔ کبھی انسان کے نفس کا مخفی تکبُّر ایک نمائشی تواضع اور دکھاوے کی درویشی وخدارسیدگی کا روپ دھار لیتا ہے۔ اور یہ چیز اس کی چال میں نمایاں نظر آتی ہے۔ کبھی انسان واقعی دنیا اور اس کے حالات سے شکست کھا کر اور اپنی نگاہ میں آپ حقیر ہوکر مریل چال چلنے لگتا ہے۔ حضرت لقمان کی نصیحت کا منشا یہ ہے کہ اپنے نفس کی ان کیفیات کو دور کرو اور ایک سیدھے سادھے معقول اور شریف آدمی کی سی چال چلو۔ جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو، نہ مریل پن، اور نہ ریاکارانہ زہد وانکسار۔ صحابہ کرامؓ کا ذوق اس معاملہ میں جیسا کچھ تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو سر جھکائے ہوئے چلتے دیکھا تو پکار فرمایا ''سر اُٹھا کر چل، اسلام مریض نہیں ہے۔'' ایک اور شخص کو اُنہوں نے مریل چال چلتے دیکھا تو فرمایا ''ظالم، ہمارے دین کو کیوں مارے ڈالتا ہے۔'' ان دونوں واقعات سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک دین داری کا تقاضا ہرگز یہ نہیں تھا کہ آدمی بیماروں کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھے اور خواہ مخواہ مسکین بنا چلا جائے۔ کسی مسلمان کو ایسی چال چلتے دیکھ کر انہیں خطرہ ہوتا تھا کہ یہ چال دوسروں کے سامنے اسلام کی غلط نمائندگی کرے گی اور خود مسلمانوں کے اندر افسردگی پیدا کردے گی۔ ایسا ہی واقعہ حضرت عائشہؓ کو پیش آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک صاحب بہت مضمحل سے بنے ہوئے چل رہے ہیں۔ پوچھا انہیں کیا ہوگیا؟ عرض کیا گیا کہ یہ قرّاء میں سے ہیں (یعنی قرآن پڑھنے پڑھانے والے اور تعلیم وعبادت میں مشغول رہنے والے)۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا ''عمر سید القراء تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب چلتے تو زور سے چلتے، جب بولتے تو قوت کے ساتھ بولتے اور جب پیٹتے تو خوب پیٹتے تھے۔'' وہیں اس چال میں ہمارا ہر وہ عمل بھی شامل ہے جسے ہم انجام دیتے ہیں۔ زندگی میں انجام دی جانے والی ہر سرگرمی کے لیے اعتدال بہت ضروری ہے۔ میانہ روی، طرفین کے بیچ معتدل موقف سے عبارت ہے، جس میں افراط وتفریط نہ ہو، غلو وزیادتی، اور کمی وکوتاہی نہ ہو۔ یہ روحانیت ومادیت، واقعیت ومثالیت اور انفرادیت واجتماعیت کے درمیان ایک درست پیمانہ ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے ''اَلوَسطُ فَضِیلَۃٌ بَینَ رَذِیلَتَینِ''، یعنی دو کمتر اعمال کے درمیان ایک فضیلت وبرتری اعتدال اور میانہ روی کہلاتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام امن وسلامتی تحمل وبرداشت، رواداری اور احترام آدمیت کا سب سے عظیم مذہب ہے۔ اسلام کی نگاہ میں سب انسان بغیر کسی تفریق وامتیاز کے احترام کے مستحق ہیں۔ اسلام میں عدم برداشت اور انتہاپسندی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسلام وہ آفاقی عظیم مذہب ہے جس نے ساری کائنات کو امن وسلامتی اور بنی نوع انسان کے لیے احترام کا درس دیا ہے۔ یہ اسلام کی شان اور عظمت ہی ہے کہ اس نے اشرف المخلوقات کے لیے پرامن بقائے باہم مذہب وملت لَکُم دِینُکُم وَلِیَ دِین (تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین) کا عظیم تصور پیش کیا۔ اسلام ہی نے انسانی عظمت کے مینار کو بلند کرتے ہوئے اس کو غیر جانبداری، اعتدال پسندی اور امن وسلامتی کا وہ منشور وفلسفہ عطا کیا جس پر اسلام کی عمارت تعمیر ہے۔ اسلام نے ساری کائنات کی مخلوق کو یہ درس دیا کہ ملت اسلامی کا رب سارے جہاں کا رب ہے۔ اس کی سب سے بڑی عظمت وشان یہ ہے کہ وہ رحمان ورحیم ہے۔ غفور الرحیم ہے۔ آج ملک سے مذہبی انتہاپسندی کے خاتمے، فرقہ واریت سے نجات، دینی اور ملی یگانگت کے لیے ضروری ہے کہ اسلام کے اخوت ومساوات اور اتحاد ویگانگت، روشن خیال اور اعتدال پسندی کے پیغام کو عام کیا جائے۔ اعتدال پسند معاشرے کی تشکیل کے لیے تجاویز، اسلامی معاشرے میں امن کے قیام، مملکت کے استحکام اور پرامن بقائے باہم کے لیے ضروری ہے کہ تحمل وبرداشت، عفو ودرگزر، حلم وبردباری، رواداری، روشن خیالی اور اعتدال پسندی کو فروغ دیا جائے۔ یہی وہ تعلیمات ہیں جن پر عمل کرکے ہم فرقہ واریت سے نجات اور مذہبی انتہاپسندی کا

خاتمہ کر سکتے ہیں نیز فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دے سکتے ہیں۔

اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”خبردار میرے بعد کفر کی طرف نہ لوٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔“ یہی بات قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بھی فرمائی ہے کہ: ”سب مل کر اللہ کی رسی (ہدایت کی رسی) کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔“ (سورہ آلِ عمران، آیت 103)۔ ایک موقع پر فرمایا: ”قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ“ (سورہ الشوریٰ، آیت 13)۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رسول اکرمؐ کے اسوہ حسنہ کے متعلق لکھتے ہیں ”اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو جس اعلیٰ درجے کے اخلاق اور اعلیٰ درجے کے طبعی و خلقی موزونیت سے نوازا تھا۔ وہ آنے والی صدیوں اور موجودہ و آیندہ نسلوں کے لیے معراج کمال ہے اور اسے ہم اعتدال فطرت (اعتدال پسندی، میانہ روی) سلامت ذوق، لطافت شعور، توازن و جامعیت اور افراد و تفریط سے پاک تعبیر کر سکتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ کو جب دو کاموں میں کسی ایک کو ترجیح دینی ہوتی تو آپؐ ہمیشہ اسے اختیار فرماتے جو زیادہ سہل ہوتا۔ بشرطیکہ اس میں گناہ کا شائبہ نہ ہو، اگر اس میں گناہ ہوتا تو آپؐ اس سے سب سے زیادہ دور ہوتے۔

درمیانی روش کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایک فرمایا ہے کہ: ”اِسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک ’اُمّت وَسَط‘ بنایا ہے تا کہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رُسول تم پر گواہ ہو۔“ (سورہ البقرہ، آیت 143)۔ آیت کی تفسیر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں یہ اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت کا اعلان ہے۔ ’اسی طرح‘ کا اشارہ دونوں طرف ہے: اللہ کی اُس رہنمائی کی طرف بھی، جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور وہ ترقی کرتے کرتے اِس مرتبے پر پہنچے کہ ”اُمّتِ وَسَط“ قرار دیے گئے، اور تحویلِ قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سَمت سے دُوسری سَمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف سَمت قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دُنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزُول کیا اور اُمّتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔ ’اُمتِ وَسَط‘ کا لفظ اس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دُوسرے لفظ سے اس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے مراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل و انصاف اور توسّط کی روش پر قائم ہو، جو دنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔ پھر یہ جو فرمایا کہ تمھیں ’اُمّتِ وَسَط‘ اس لیے بنایا گیا ہے کہ ’تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسُول تم پر گواہ ہو‘، تو اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا اُس وقت رسُول ہمارے ذمّہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اُسے دی تھی۔ وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسُولؐ کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اُٹھنا ہوگا۔ یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسُول نے جو کچھ تمھیں پہنچایا تھا۔ وہ تم نے انہیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسُول نے تمھیں دکھایا تھا وہ تم نے انہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اس طرح کسی شخص یا گروہ کا اس دُنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اس کا امامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمّہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسُول صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمّت کے لیے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے۔ اسی طرح اِس اُمّت کو بھی تمام دُنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے۔ حتّٰی کہ اس کے قول اور عمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دُنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اس کا نام ہے۔ راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس طرح خدا کی ہدایت ہم تک پہنچانے کے لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمّہ داری بڑی سخت تھی۔ اگر وہ اِس میں ذرا سی کوتاہی بھی کرتے تو خدا کے یہاں ماخوذ ہوتے۔ اُسی طرح دُنیا کے عام انسانوں تک اس ہدایت کو پہنچانے کی نہایت سخت ذمّہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس بات کی شہادت نہ دے سکیں کہ ہم نے تیری ہدایت، جو تیرے رسُولؐ کے ذریعے سے ہمیں پہنچی تھی، تیرے بندوں تک پہنچا دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، تو ہم بہت بُری طرح پکڑے جائیں گے اور یہی امامت کا فخر ہمیں وہاں لے ڈوبے گا۔ ہماری امامت کے دَور میں ہماری واقعی کوتاہیوں کے سبب سے خیال اور عمل کی جتنی گمراہیاں دُنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں۔ اُن سب کے لیے ائمۂ شر اور شیاطینِ انس و جِنّ کے ساتھ ساتھ ہم بھی ماخوذ ہوں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دُنیا میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا، تو تم کہاں مر گئے تھے؟ اس پوری گفتگو سے یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ بے اعتدالی یا شدت پسندی اسلام کا حصہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح کی چیزیں فرد واحد کو بھی اور کل اجتماعیت کو بھی دنیا و آخرت میں ناکامی سے دوچار کرنے والی ہیں۔ اس کے بالمقابل اعتدال پسند اور میانہ روی اسلام کے شایان شان ہے۔ لہذا اس کا اظہار ہمارے فکر و نظر اور عمل سے ظاہر ہونا چاہیے۔

MOAHAMMAD ASIF IQBAL
Media Secretary,
JIH Haryana & Delhi
maiqbaldelhi@gmail.com

کیمپس میں گام
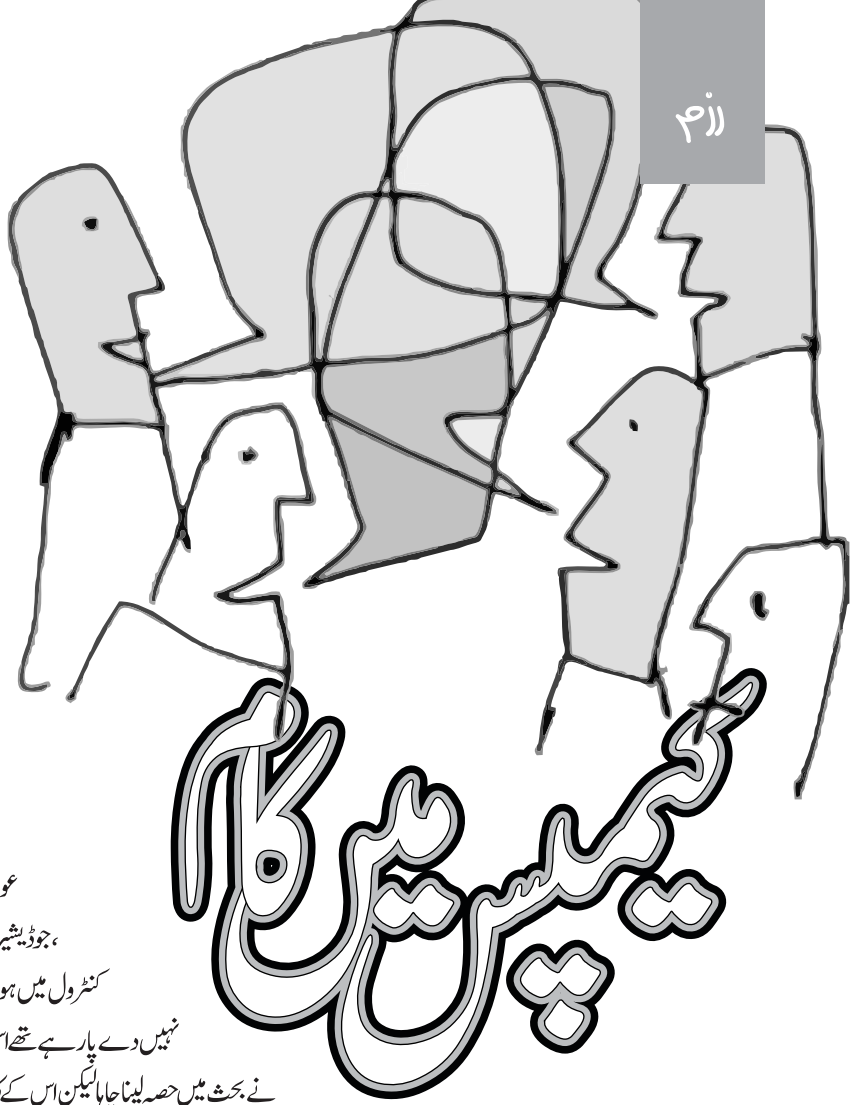
امین عثمانی

(چھٹی قسط)

فیکلٹی آف سائنس کے لان میں ایم ایس سی کے طالب علم شاکر، حسن خاں اور نوین دونوں کے ساتھ بحث میں الجھے ہوئے تھے، ابوالعاص اپنے کلاس میں جانے کے لئے وہاں سے گزر رہے تھے کہ ان کی نظر تیز آواز میں ہونے والی بحث کرنے والوں پر پڑ گئی وہ وہاں جا پہنچے۔ بحث تیز ہو چکی تھی، حسن خاں اور نوین دونوں لبرل سوچ رکھنے والے فری مائنڈ، الٹرا ماڈرن طالب علم تھے، یہ دونوں کمپیوٹر سائنس کے طالب علم تھے، ابوالعاص نے سنا تو معلوم ہوا کہ بحث ہندوستانی مذاہب پر ہو رہی ہے۔ یہ سارے مذہب جو بھارت میں پائے جاتے ہیں انہوں نے ساری آزادیاں چھین لیں۔ مردوں کی بھی اور عورتوں کی بھی۔ حسن خاں اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہہ رہے تھے کہ اسلام دھرم میں عورتوں کو کوئی آزادی نہیں بلکہ وہ ایک افیم کی طرح ہے جس میں سب پڑھے لکھے جاہل اور عالم سب مست ہوتے ہیں۔ شاکر ان دونوں طلبہ کے غیر سنجیدہ انداز سوال اور جارحانہ طرز اعتراض پر سخت غصہ کے موڈ میں تھا مگر وہاں حسن خاں اور نوین چپ ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ان لوگوں نے کہا کہ مذہب اسلام میں نہ ڈیموکریسی ہے، نہ فریڈم ہے اور نہ عورتوں کو کوئی پولیٹکل رائٹ حاصل ہے بلکہ پورے اسلامک ورلڈ میں یا تو کنگ ڈم ہے یا ڈکٹیٹر شپ ہے۔ ڈیموکریسی ہے بھی تو وہ بھی نام اور دکھاوے کے لئے تبھی تو ایک ایک مسلم رولر 20 سال، 30 سال بلکہ 40 سال تک حکومت کرتا رہتا ہے۔ اپنے عوام کے اوپر مسلط ہوتا ہے اور عوام کی آواز کو دباتا اور کچلتا ہے۔ آرمی، جوڈیشیری، سکریٹ ایجنسی سب اس کے کنٹرول میں ہوتی ہیں۔ شاید شاکر کچھ اچھی طرح جواب نہیں دے پا رہے تھے اس لئے غصہ میں الجھ رہے تھے۔ ابوالعاص نے بحث میں حصہ لینا چاہا لیکن اس کے کلاس کا وقت ہو چکا تھا اس لئے یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلتا بنا کہ وہ ان دونوں سے کل بات کرے گا، یا کسی اور وقت۔ حسن خاں یونیورسٹی میں بس نام کے حسن تھے، ورنہ ان کی سوچ میں کوئی حسن نہ تھا۔ ان کے سارے طور طریقے بالکل لبرل اور آزاد خیال لوگوں جیسے تھے۔ ابوالعاص کلاس میں تو چلے گئے لیکن ان کے ذہن میں یہ سوالات گونجتے رہے کہ آخر مجھے ان لوگوں کے جوابات کیا دینے چاہئے۔

کلاس ختم ہونے کے بعد ابوالعاص پروفیسر عبدالوحید کے پاس جا پہنچے جو فزکس کے پروفیسر تھے اور اسلام کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ ان کے سامنے جب یہ بات آئی کہ کچھ طلبا کو گفتگو کرنی ہے تو انہوں نے کہا کہ اسلام کے پولیٹکل سسٹم اور اسلام میں عورتوں کے پولیٹکل رائٹس کے بارے میں کافی کتابیں انگریزی میں موجود ہیں اور اردو میں بھی۔ بنیادی طور اسلام شورائی نظام کو ترجیح دیتا ہے جس میں خدا پرستی اور تقوی، صالحیت بنیادی اوصاف ہیں اور کوئی خود کسی منصب کا امیدوار بننا چاہے اور اس کی خواہش ظاہر کرے تو اس کو اسلامی سیاسی نظام میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور شوری میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی فہم و فراست، سمجھ بوجھ اور باخبری میں دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں اور سماج ان کی نیکی اور دین داری پر متفق ہوتا ہے۔ یہ اسلام کا اصل معیار سیاست ہے۔ اب اس مجلس شوری کو

جونام بھی دیا جائے۔آپ جدید اصطلاح میں اس کو پارلیمنٹ بھی کہہ سکتے ہیں، مجلس بھی کہہ سکتے ہیں جیسا کہ مختلف ملکوں میں کہا جاتا ہے۔لیکن اسلام دراصل سماج میں خداپرستی اور اچھے اخلاق کے ساتھ ساتھ انصاف کوفروغ دینا چاہتا ہے اور ظلم کو مٹانا چاہتا ہے۔انہیں بنیادوں پر وہ اپنے سیاسی نظام کو کھڑا کرتا ہے اور بناتا ہے۔باقی یہ کہ حاکم اور امیر کے اوصاف وخصائل کیا ہونے چاہئیں اس پر اسلامی سیاسی نظام میں تفصیل سے باتیں لکھی گئی ہیں۔پروفیسر صاحب نے جلدی جلدی سات آٹھ کتابوں کے نام گنائے اور یہ بھی بتایا کہ یہ کتابیں فلاں فلاں جگہ سے ابھی مل سکتی ہیں۔چنانچہ ابوالعاص وہ کتابیں لے کر شاکر کے پاس پہنچا اور پھر اس رات جو اسلام پسند طلبا تھے انہوں نے اسلام کے سیاسی نظام اور اس میں عورتوں کے حقوق اور حصہ داری کے موضوع پر کافی تفصیل سے پڑھا۔

اتفاق کی بات کہ جب یہ لوگ گفت گو کی تیاری کر رہے تھے تبھی خبر ملی کہ حسن خاں کے والد کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ کار حادثہ میں شدید زخمی ہو کر اس دنیا سے چل بسے ہیں۔حسن پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور وہ پونہ کے لئے نکل رہا ہے۔یہ سارے لڑکے (جو اسلام پسند طلبا تھے) فوراً اس کی تعزیت کے لئے پہنچے ،اس کو دلاسہ دلایا اور یہ بتایا کہ موت اور زندگی یہ دونوں اللہ تعالی نے پیدا کیا ہے اور یہ دونوں کسی کے اختیار میں نہیں نہ کوئی موت سے بچا ہے نہ بچ سکتا ہے اور ہر ایک کا وقت مقرر ہے،اس کا پتہ صرف اللہ کو ہے کہ جب موت آتی ہے تو پھر کچھ بھی دیر نہیں ہوتی، جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں ان کو اپنے عزیز کے جانے کا صدمہ اور غم ہوتا ہے تو سنو حسن اگر تم کو واقعی اپنے والد کے لئے کچھ کرنا ہے تو پھر ان کے لئے اپنے رب سے دعا مغفرت کرو اور ان کی طرف سے صدقہ کرو اور ان کے نام سے یا تو پیڑ پودے لگاؤ یا پھر کنویں ٹیوب ویل بنواؤ تا کہ اس سے مخلوق خدا کو فائدہ ہو اور اس کا ثواب ان کو پہنچتا رہے اور تم یہ بھی کر سکتے ہوں کہ ان کی طرف سے عمرہ یا حج کرو۔حسن خاں اس وقت بہت غمگین تھے اور جلدی میں تھے انہوں نے کچھ جواب نہ دیا البتہ فوراً ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔جب ان کا جہاز اڑا تو وہ سوچتے رہے کہ پھر جو خدا اتنا طاقتور ہے جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے اس نے میرے والد کو اٹھا لیا اب یقیناً وہ ہمیں بھی ایک دن اٹھا لے گا کیونکہ وہ عظیم اور طاقتور ہے اور اس کے آگے کسی کی نہیں چلتی، تو ہمیں پھر سوچنا چاہئے کہ جس ہستی کے ہاتھ میں موت وحیات دونوں ہے اس کو پورے طور پر ماننے اور اس کے آگے جھکنے میں کیا حرج ہے۔یہ آواز اس کے ضمیر کی تھی جو اس کو پکار رہی تھی۔دل پر ہونے والی اس دستک کو اس کے دماغ نے سن لیا اور پھر وہ جب ممبئی پہنچا تو والد کی تدفین کے بعد وہ مسجد میں چلا گیا۔غالباً وہ پہلی بار مسجد میں داخل ہوا تھا کیونکہ وہ خدا بیزار تھا اس نے قرآن کھولا تو چونکہ وہ عربی پڑھا نہیں ہوا تھا تو ٹرانسلیشن کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور آخر میں اس کو ایک ہندی ترجمہ مل گیا۔حسن اتفاق یہ کہ اس نے جو سورہ کھولی اس میں آیت کا آغاز یہیں سے ہو رہا تھا کہ ”وہ ذات بڑی بابرکت ہے جس کے ہاتھ میں ساری قوت ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اور اسی نے موت وحیات کو پیدا کیا ہے تا کہ وہ تم سب کو آزما سکے کہ تم میں کس کا عمل زیادہ بہتر ہے اور لائق اجر ہے۔“ اس آیت کے ترجمہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔اس کا دل بدل گیا۔سچ ہے جب انسان کا دل بدلتا ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے۔حسن خاں پونہ میں جب تک رہے اپنے گھر پر قرآن کی تلاوت کرتے رہے اور نماز بھی پابندی سے شروع کر دی۔جب وہ پلٹ کر آئے تو وہ ایک دوسرے انسان تھے۔

ادھر یہاں یونیورسٹی میں جو اسلام پسند طلبا تھے وہ اس انتظار میں تھے کہ جب وہ آئیں گے تو ان سے پرسش احوال کے بعد دھیرے دھیرے کچھ گفتگو کی جائے گی لیکن ان سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے حسن خاں کو

اسلام دراصل سماج میں خداپرستی اور اچھے اخلاق کے ساتھ ساتھ انصاف کوفروغ دینا چاہتا ہے اور ظلم کو مٹانا چاہتا ہے۔انہیں بنیادوں پر وہ اپنے سیاسی نظام کو کھڑا کرتا ہے اور بناتا ہے۔باقی یہ کہ حاکم اور امیر کے اوصاف وخصائل کیا ہونے چاہئیں اس پر اسلامی سیاسی نظام میں تفصیل سے باتیں لکھی گئی ہیں۔

واقعی بدلا ہوا پایا۔ اب نظریاتی اور فکری بحث کی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ کام آسان تھا۔ صرف مطالعہ کی کمی تھی جو دھیرے دھیرے پوری کی جا سکتی تھی۔ بہر حال وہ اسلام پسند طلبا کے گروہ میں شامل ہو گیا۔

اسلام پسند طلبا نے ایک پروگرام یہ بنایا کہ اتوار کو ہمیں غریب لوگوں کی بستیوں اور جھونپڑیوں میں جانا چاہئے اور وہاں کے بچوں، لڑکوں اور جوانوں سے ملنا چاہئے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم تاکہ ہم ان کے حالات کو تفصیل کے ساتھ سمجھ سکیں اور جو کچھ ہم آپس میں چندہ کر کے ان کو تحفہ و تحائف دے سکتے ہوں وہ ان میں تقسیم کریں، چنانچہ گیارہ طلبا کا یہ گروہ غریبوں کی بستیوں، جھگی، جھونپڑیوں میں جا پہنچا اور اس نے گھوم گھوم کر ہر جگہ مل کر بات چیت کر کے ان کے مسائل اور مشکلات کو سمجھنا چاہا۔ ان پڑھ بچوں کی پڑھائی کا مسئلہ تھا، بے روزگار اور بے ہنر نوجوانوں کے روزگار کا مسئلہ تھا، بیماروں اور مریضوں کے علاج اور مدد کا مسئلہ تھا۔ ان سب چیزوں سے واقف ہونے کے بعد یہ واپس لوٹ آئے اور پھر انہوں نے ایک نیا منصوبہ بنایا کہ ہم کسی ڈاکٹر سے بات کر کے اور کچھ مفت دوائیں اکٹھا کر کے ان بستیوں میں فری علاج کے لئے جائیں گے اور اس خدمت کو انجام دیں گے۔ جو بچے پڑھنے کے لائق ہیں ان کے ایڈمیشن کے لئے ہم خود پیسے اکٹھا کر کے ان کے داخلے کرائیں گے اور اس کے لئے جو کچھ بھی کرنا پڑے کریں گے۔ بے روزگار نوجوانون میں سے اگر کچھ نوجوان ہنر سیکھنا چاہتے ہیں تو ان کو چھوٹے پیشے سے جوڑنے کے لئے ان کو ہنر سکھانے کا انتظام مختلف حلقوں کی مدد سے انجام دیں گے، چنانچہ طلبا کے اس گروپ نے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا۔ ان تمام بچوں کا مختلف سرکاری اسکولوں اور دیگر اسکولوں میں ایڈمیشن کرایا۔ ان کو ساری سہولتیں فراہم کرائیں۔ اس کے لئے بہت محنت کی۔ ان میں جو مسلمان بچے تھے ان کو قرآن اور دعائیں سکھانے کے لئے اور نماز کی تعلیم کے لئے اپنے میں سے خود وقت تقسیم کیا اور اس اہم دینی کام کو انجام دینے کی کوشش کی۔ لیکن یہ یونیورسٹی کی تعلیم کی مصروفیات میں سے کتنا وقت نکال پاتے۔ چنانچہ جب ان کو دشواری ہونے لگی تو انہوں نے ایک مسجد کے امام صاحب کو اس کام پر لگا دیا کہ وہ یہ خدمت انجام دیں اور یہ لوگ ان کا کچھ نہ کچھ تعاون کرتے رہیں گے۔ چونکہ جھگی، جھونپڑی اور غریبوں کی بستیوں میں بیماروں اور مریضوں کے بارے میں بھی ان کو علم ہوا تھا اس لئے ان طلبا نے یہ طے کیا کہ شہر میں جو ہاسپٹلس ہیں اور اس میں جو لوگ ایڈمٹ ہیں ان کے لئے وہ ایک گھنٹہ کا وقت سنیچر یا اتوار کو نکالیں گے اور وہاں ان سے مل کر ان کی مشکلات اور پریشانیاں جاننے اور مدد کرنے کی کوشش کریں گے، چنانچہ یہ کام بھی ان لوگوں نے شروع کیا لیکن اندازہ ہوا کہ اس میں مختلف قسم کی الگ الگ دشواریاں ہیں۔ کہیں خون کی ضرورت ہے تو کہیں پیسوں کی ضرورت ہے تو کہیں کسی کا کوئی

۔ جو بچے پڑھنے کے لائق ہیں ان کے ایڈمیشن کے لئے ہم خود پیسے اکٹھا کر کے ان کے داخلے کرائیں گے اور اس کے لئے جو کچھ بھی کرنا پڑے کریں گے۔ بے روزگار نوجوانون میں سے اگر کچھ نوجوان ہنر سیکھنا چاہتے ہیں تو ان کو چھوٹے پیشے سے جوڑنے کے لئے ان کو ہنر سکھانے کا انتظام مختلف حلقوں کی مدد سے انجام دیں گے، چنانچہ طلبا کے اس گروپ نے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا۔ ان تمام بچوں کا مختلف سرکاری اسکولوں اور دیگر اسکولوں میں ایڈمیشن کرایا۔

پرسان حال نہیں ہے تو اس کے دیکھ ریکھ کی ضرورت ہے۔ بہر حال ان سب نے ان مریضوں کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا وہ کیا اور جو صحت مند طلبا تھے ان کے ذریعہ سے خون کا بھی انتظام کرایا اور سب کے لئے ہمدردی کے کلمات کہے اور ان سب کو حوصلہ دلایا۔

اس انسانی خدمت کے نتیجہ میں ان طلبا کے حوصلے کافی بلند ہو گئے تھے اور یہ اپنے آپ میں ایک طرح کا اطمینان اور خوشی محسوس کر رہے تھے کہ وہ انسانوں کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ مخلوق خدا کی خدمت بہت ہی اہم کام ہے۔ اللہ تعالی کی مخلوقات بہت سی ہیں۔ جب بلی اور کتے کو پانی پلانے پر مغفرت اور بخشش ہو سکتی ہے، جب پرندوں اور جانوروں کے ساتھ رحم کا سلوک کرنے پر ثواب مل سکتا ہے تو پھر آدم کی اولاد کی مدد کرنے پر یقینا ثواب ملے گا خواہ اس کا کسی بھی مذہب اور دین سے تعلق ہو۔ ان طلباء کے اپنے پروگرام یونیورسٹیز میں چل رہے تھے۔ لیکچر، درس قرآن اور مطالعہ کے لئے لٹریچر کی تقسیم۔ یہ سارے کام جاری تھے کہ ان کے سامنے ایک سوال یہ آیا کہ یہ جو بے عملی یا بد عملی ہے یہ کسی بھی انسان کو کہاں تک لے جا سکتی ہے، کیا یہ ارتداد ہے، کیا یہ کفر ہے، کیا یہ انکار ہے، یہ اس بے دینی یا بے عملی کو کس چیز سے تعبیر کریں اور اس کی کیا درجہ بندی کریں اور کیسے کریں۔

ماجد نے کہا کہ ارتداد کی کئی قسمیں ہیں، ایک عقیدہ کا ارتداد ہوتا ہے، ایک فکر کا ارتداد ہوتا ہے، ایک عمل کا ارتداد ہوتا ہے، عقیدہ کا ارتداد تو یہ ہے کہ توحید، رسالت، آخرت کا انکار ہو۔ فکر کا ارتداد یہ ہے کہ تمام مذاہب کو برحق سمجھا جائے اور سب کی چیزیں تھوڑی تھوڑی لے لی جائیں اور آدمی کج فہمی میں بدعقلی کا شکار ہو، اس کی فکر آزاد ہو تو یہ فکری ارتداد ہے۔ عملی ارتداد یہ ہے کہ انسان نہ روزہ رکھے، نہ

نماز پڑھے، نہ زکوۃ دے، نہ حج کرے، مسلمانوں کے درمیان تو رہے لیکن مسلمانوں کی طرح نہ ہو۔ اسلام سے عملی اعتبار سے بہت دور ہو تو یہ عملی ارتداد ہے۔

زاہد نے کہا کہ یہ بات تو صحیح ہے لیکن دل کو اللہ تعالی پلٹتا ہے اور توفیق وہی دیتا ہے۔ دل کو وہی کھولتا ہے۔ جب انسان کا دل و دماغ کھلتا ہے اور عقل صحیح راستہ پر چلنے لگتی ہے اور رائٹ ڈائریکشن میں سوچنے لگتی ہے تو پھر وہ واپس پلٹتا ہے اور حقیقت کو جاننے کی کوشش کرتا ہے تو اگر کوئی شخص کلمہ تو پڑھتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا تو نہ تو وہ مرتد ہے اور نہ وہ کافر ہے کیونکہ اس کلمہ کی برکت سے ایک نہ ایک دن اللہ تعالی اس کے اندر تبدیلی لائے گا۔ چاہے اس نے کوئی نیک عمل نہ کیا ہو۔ بقیہ طلبہ کو بہت حیرت ہوئی کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ماجد نے جواب دیا اللہ تعالی رحمن و رحیم ہے اور غفور و غفار ہے۔ اس نے دنیا میں اپنی رحمت کا صرف ایک حصہ رکھا ہے اور اس کو ساری مخلوقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ جب کہ رحمت کا ننانوے حصہ اس نے اپنے پاس محفوظ رکھا ہے جس کا اظہار آخرت کے دن ہوگا۔ کلمہ کی برکت سے اگر اللہ نے چاہا تو وہ کلمہ پڑھنے والے کو ضرورت اپنی مغفرت اور رحمت سے آخرت میں نوازے گا۔ پھر انہوں نے کئی حدیثیں بھی بیان کی جو اسی مفہوم کی تھیں۔ بہر حال یہ تو ایک گفتگو تھی جو نوجوانوں اور طلبا کے درمیان ہوتی رہتی ہے۔

اگلے سنڈے کو یونیورسٹی کا ایک کلچرل پروگرام ہونا تھا۔ یونیورسٹی میں جو مدرسے سے تعلیم حاصل کر کے دو چار طلبا آئے تھے وہ کلچرل پروگرام کی مخالفت کر رہے تھے اور چونکہ اس میں لڑکے لڑکیاں سب ہوتے ہیں اور میوزک کا بھی استعمال ہوتا ہے اس لئے مدرسہ سے آئے ہوئے طلبا جن کو یونیورسٹی میں داخلہ مل چکا تھا، گرچہ وہ جونیئر تھے لیکن وہ اس پروگرام کی مخالفت کر رہے تھے۔

کلچرل پروگرام میں دف کا استعمال یا ہلکی دھن کا استعمال یا ڈرامہ یا مونو ایکٹنگ جو موضوع کے اعتبار سے ہو اور کوئی خاص سبق دیتا ہو اور کسی خاص ایشو کو بتاتا ہو، اسی طرح پروگرام میں جدت اور ندرت پیدا کرنا اور اس کو خوبصورت سے خوبصورت انداز سے پیش کرنا اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جس طرح ثقافتی پروگرام دنیا بھر میں ہوتے ہیں اور اس میں تنوع بھی ہوتا ہے، تفنن بھی ہوتا ہے اور جس طرح حفظ و تلاوت قرآن کا مقابلہ ہوتا ہے، نعت خوانی کا مقابلہ ہوتا ہے، شعر گوئی اور بیت بازی کا مقابلہ ہوتا ہے، کشتی اور جمپ کا مقابلہ ہوتا ہے، دوڑ کے مقابلے ہوتے ہیں، اسی طرح سے ایسے ایکٹنگ کے پروگرام ہو سکتے ہیں جس سے کوئی خاص بات بتائی جاتی ہو۔ کوئی پیغام دیا جاتا ہو۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کارٹون کے ذریعہ سے پیغام دیئے جاتے ہیں۔ کارٹون سیاسی بھی ہوتے ہیں، تنقیدی بھی ہوتے ہیں۔ بہت سے مسلم ملکوں میں تو نغمہ سنجی کے بھی مقابلہ ہوتے ہیں کہ کون سب سے اچھی غزل یا نغمہ۔ نغمہ اور میوزک کے ذریعہ پیش کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ بھی اہم بات ہے کہ تیونس کے انقلاب میں گلوکاروں نے انقلابی نغمے دھنوں پر گا کر عوام کو انقلاب کے لئے آمادہ کیا۔

اصل بات یہ ہے کہ نئی نسل اور نوجوان نسل خواہ وہ کالج میں ہوں یا یونیورسٹی یا اسکول میں ان کے لئے جس طرح صحت و تندرستی کے لئے ورزشی مقابلہ کرائے جاتے ہیں اسی طرح سے ملک کے اندر تبدیلی لانے کے لئے اور اچھے نعرے دینے کے لئے میڈیا کے استعمال کے بجائے اگر اچھے دھنوں اور ساز پر انقلابی نغمے، سیاسی تبدیلی لانے کے لئے نغمے، ظالم و جابر حکمراں کو تخت سے اتارنے کے لئے نغمے گائے جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بہر حال یونیورسٹی میں کلچرل پروگرام ہر فیکلٹی کے الگ ہوتے ہیں اور یونیورسٹی کے سطح پر بھی ہوتے ہیں۔ اسلام پسند طلبا کو سوچنا چاہئے کہ وہ ثقافتی میدان میں بہتر سے بہتر پیغام خوبصورت اسلوب میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ جو نوجوانوں کو پسند آئے اور ان کو آسانی سے یاد بھی ہو جائے۔

دہلی کے ایک اسکول میں صبح سویرے کی پریئر میں پرنسپل نے ایک مسلمان ٹیچر سے یہ پوچھا کہ ہم پریئر میں اشلوک پڑھتے ہیں اور بچوں کو یاد کراتے ہیں، آپ کیا قرآن میں سے کچھ بتا سکتے ہیں کہ جس کو صبح کے پریئر میں پڑھایا جائے؟ تو مسلمان ٹیچر نے "قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ" (سورہ آل عمران، آ 26) کی آیت انگریزی ترجمہ کے ساتھ پرنسپل کو دے دی اور صبح میں اس آیت کی تمام بچوں کے درمیان پڑھے اور سنائے جانے کی وجہ سے یہ سوال ابھرا کہ اس آیت کا مطلب اور مفہوم کیا کیا ہے اور قرآن کیا کہنا چاہتا ہے۔ اور انسانوں کے نام اس کا خطاب کیا ہے۔ ان آیات کو پڑھنے سے بہت سے خاندانوں اور گھروں میں خود بخود اسلام پہنچ گیا اس لئے یہ غور کرنا چاہئے کہ دعوت کے مزید اور کیا طریقے ہو سکتے ہیں جو طبیعت اور ذہن کو بوجھل بنائے بغیر دلوں تک سرایت کر جائے اور اس میں نفوذ ہو جائے۔ بہر حال یونیورسٹی میں جو کلچرل پروگرام منعقد ہوئے اس میں تمام اسلام پسند طلبا نے الگ الگ فیکلٹیز میں حصہ لیا اور طلبہ میں کام کرنے کے لئے ہر جگہ حاضر رہے۔ عبد البدی سقرؒ نے دہلی کے سفر کے دوران یہ بتایا کہ ان کے مرشد حسن البناؒ مصر کے ایک بہت بڑے پیر سے جا کر مرید ہو گئے۔ حسن البناؒ سے جو لوگ قریب تھے تو انہوں نے ان سے دریافت کیا کہ یہ آپ نے کیوں کیا، اس میں کوئی خاص حکمت و مصلحت؟ انہوں نے کہا مجھے پیر سے کام نہیں بلکہ پیر کے مریدین سے کام ہے۔ اور مجھے مریدین تک پہنچنا اور ان کو اصل دعوت تک پہنچانا پیش نظر تھا۔ بہر حال طریقہ کار، حکمت عملی، اسٹریٹجی بدلتی رہتی ہے۔ اور ضرورت یہ بتاتی اور سکھاتی ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں کون سا میتھڈ زیادہ مؤثر اور ایفکٹیو ہوگا۔

Ameen Usmani
Secretary,
Islamic Fiqh Academy, India.

نام کتاب : ہندوستان : ابتدائی مسلم مورخین کی نظر میں
مصنف : سیّدعثمان شیر
صفحات : 362، قیمت 300/-(پیپر بیک)،اشاعت 2018
ناشر : فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ
مبصر : محمد عارف اقبال

ہندوستان صدیوں قبل ایک سحرانگیز سرزمین تھی۔اس کی کشش میں یونان کا بادشاہ سکندر اعظم (327ق۔م) بھی مبتلا ہوا۔لیکن اس کا ہندوستان کو فتح کرنے کا خواب چکنا چور ہوگیا۔لیکن اس سے قبل ہی وادی سندھ کی تہذیب کا خاتمہ آریاؤں کے ہاتھوں ہوگیا تھا۔یہ نیم آوارہ گرد،وحشی،بحیرہ اسود اور بحیرہ خزر (کیپسیئن) کے درمیان یوریشیا کے وسیع گھاس کے میدانی علاقے کے باسی تھے۔فرانسس واٹسن کے مطابق ان کی یورش ایک غضب ناک طوفان کی طرح تھی،ایسے لوگ جو شہری زندگی سے بالکل ناواقف تھے۔کہا جاتا ہے کہ آریوں کے ہندوستان میں قدم جمانے کے تقریباً ایک ہزار سال بعد تاریخ کی تبدیلی کا مرحلہ ایک نئی شکل لے کر سامنے آیا۔یہ بھی خیال ہے کہ دنیا میں تاریخی دور کی ابتدا دسویں صدی قبل مسیح (ق۔م) میں ہوئی۔لیکن چھٹی صدی ق۔م کے وسط میں مگدھ یا جنوبی بہار میں 544ق۔م۔میں بمبسار کی تخت نشینی کے ساتھ زندگی نے ایک نئی کروٹ لی،اور مذہبی،معاشرتی اور سیاسی شعبوں میں حرکت ہوئی۔اس کے نتیجے میں رامائن اور مہابھارت کی داستانوں کی تہذیب کا مرکز جو وسطی ہندوستان میں تھا،اب گنگا ندی کے میدانی علاقوں میں منتقل ہوگیا۔یہ نیا مرکز تھا پاٹلی پُترا یعنی موجودہ پٹنہ،جو ہندو دنیا کا محور بن گیا۔تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ وہ محور چاروں طرف سے ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور رفتہ رفتہ بہت سے ٹکڑوں میں منقسم بھارت ورش کو ارتقائی مراحل سے گزار کر اس نے ایک متحدہ ہندوستان میں تبدیل کردیا۔تاریخ کی صبح مگدھ کی برتری کے ساتھ ہوئی اور اس کے ساتھ ہندوستان کا ارتقا بھی۔مگدھ میں آریاؤں کو بسے ہوئے آٹھ صدیاں گزر چکی تھیں،بے انتہا جوش اور قوت ابل رہی تھی۔544اور 150ق۔م۔کے درمیان عظیم راجاؤں نے نسل در نسل اس دھرم کی زمین کو ایسے طاقتور چکرورتی دیے جنھوں نے ہندوستان کو سیاسی طور پر ایک ملک کی حیثیت بخش دی۔لیکن پاٹلی پترا کے جس راجا دھنا نند کے خوف سے سکندر اعظم نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھنے سے انکار کردیا تھا اسی راجا دھنا نند کو اس کے ہم وطن چندر گپت موریہ نے شکست دے کر 320 قبل مسیح میں موریہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔اسی نے ہندوستان کو ایرانیوں اور یونانیوں کے قبضے سے آزاد کرایا۔اس کا پوتا اشوک دنیا کا عظیم اور انتہائی شریف النفس شہنشاہ تھا۔وہ ایسا فوجی بادشاہ گزرا ہے جس نے فتح حاصل ہوجانے کے بعد جنگوں سے توبہ کرلی تھی۔موریہ حکومت کے آغاز سے ٹھیک 600سال بعد یعنی 320عیسوی میں مگدھ کا ایک دوسرا سمراٹ تاریخ کے صفحے پر ابھرتا ہے جس کا نام بھی اتفاق سے وہی تھا جو موریہ خاندان کے بانی کا تھا،یعنی چندر گپتا (320-350)۔اس کے دور میں ہندو تہذیب پورے عروج پر پہنچ گئی۔گپتا حکمرانوں کے زمانے کو ہندوستان کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔اس کے دور میں پاٹلی پترا سے جاری کردہ فرمان خلیج بنگال سے بحیرہ عرب تک اور ہندوکش عبور کرتے ہوئے بخارا کے کچھ علاقے تک شاہی حکم کا درجہ رکھتے تھے۔لیکن چھٹی صدی کے وسط میں گپتا شہنشاہیت بھی زوال پذیری کا شکار ہوگئی۔صرف نام کے گپتا راجا چھوٹے چھوٹے علاقے میں محدود ہوکر رہ گئے۔پھر ساتویں صدی کے وسط میں شمالی ہند میں وردھنوں کی ایک طاقتور بادشاہت سامنے آئی جو راجا ہرش وردھن کے زمانے میں عروج کو پہنچی۔ہرش وردھن 606عیسوی میں تخت پر بیٹھا اور 41برسوں تک قنوج سے حکومت کرتا رہا۔بہار پر 641میں اور پھر اڑیسہ پر 643میں قبضہ کرلیا۔اس کے دَور میں ہندوستان کو امن کا ایک جھونکا تو نصیب ہوا لیکن گپتا شہنشاہیت کی صرف ایک ظاہری شباہت ہی رہی۔

مذکورہ بالا تحریر کو زیر نظر کتاب ''ہندوستان:ابتدائی مسلم مورخین کی نظر میں' کے باب اول کے اقتباسات سے مرتب کیا گیا ہے۔کتاب کے مصنف سیّدعثمان شیر نے اسی باب میں برصغیر ہند کے جغرافیہ اور تاریخ کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ آئندہ سطور میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے،قارئین کو ترتیب سے سمجھنے میں آسانی ہو۔یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔باب اول برصغیر ہند:جغرافیہ اور تاریخ،باب دوم مسلمانوں کی آمد،باب سوم برصغیر ہند میں تاریخ نویسی،باب چہارم مسلم مورخین کے بیانات،باب پنجم سترہویں صدی کے چند یورپی سیاحوں کے بیانات۔باب چہارم پانچ موضوعات کے تحت ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے۔اسی طرح باب پنجم میں بھی ذیلی عنوانات ہیں۔آخر میں حوالہ کی کتابیں اور ان کے مصنّفین کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے تاکہ تاریخ نویسی میں ان کے استناد کا بخوبی اندازہ ہوسکے۔

سیّدعثمان شیر (پ 1935) کا پیدائشی وطن صوبہ بہار کا شہر بہار شریف ہے۔انھوں نے 1955میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اقتصادیات میں ایم اے کیا اور پاکستان منتقل ہوگئے۔انھوں نے عرصے تک اقوام متحدہ،کامن ویلتھ اور سارک کے ایکسپرٹ کے طور پر کام کیا۔1991میں پاکستان کی وزارت منصوبہ بندی کے سربراہ برائے شعبہ بین الاقوامی تعلقات کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے اور کینیڈا میں مقیم ہوگئے۔انھوں نے رسائل وجرائد میں مضامین کے علاوہ کئی کتابیں انگریزی اور اردو میں تصنیف کی ہیں۔ان کی ایک کتاب India As seen by Early Muslim Chroniclers: ریجنسی پبلی کیشنز،نئی دہلی سے 2005میں شائع ہوئی تھی۔اب یہ نئی کتاب اردو قارئین

کے لیے انگریزی سے ترجمہ کرکے تیار کی گئی ہے۔ یہ کتاب قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی معاشرتی تاریخ کو بیان کرتی ہے۔ اس میں اس ملک کے جغرافیہ، نسلی پس منظر، تہذیب وتمدن اور سیاست کے متعلق بھی مختصر طور پر باتیں لکھی گئی ہیں۔ مصنف نے کتاب کے پیش لفظ میں اس بات کی بھی صراحت کردی ہے کہ اسے تاریخی تسلسل کے ساتھ پڑھنا ضروری نہیں ہے کیونکہ اس میں مختلف موضوعات پر مورخین اور وقائع نگاروں کے بیانات ہیں۔ بیانات میں حتی الامکان تکرار سے گریز کرتے ہوئے مستند حوالوں کے اہتمام کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ حکمراں کی حیثیت سے مسلمان آٹھویں صدی کے شروع میں برصغیر ہند میں داخل ہوئے۔ 712 عیسوی میں وہ سندھ پر قابض ہوگئے اور اس کے بعد بارہویں صدی کے آخر میں دلّی پر قابض ہوکر انہوں نے پورے ملک پر ایک لمبی حکمرانی کا دور شروع کیا۔ اس میں جنگوں یا حکمرانی کی تاریخ بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ سرزمین ہند کے باشندوں، ان کے عقائد اور رسم و رواج وغیرہ کے مشاہدات اہل علم اور مورخین کے حوالے سے درج کیے گئے ہیں۔ مشاہدہ کرنے والوں میں مورخ، سیاح، درباری ملازم اور خود حکمراں بھی شامل ہیں۔ نو وارد حکمراں اور فوجی و درباری مسلمانوں کے لیے ہندوستان ایک نیا اور اجنبی ملک تھا۔ ہر آدمی کے تاثرات یکساں بھی نہیں ہوسکتے۔ اس کا انحصار اس کے ذاتی تجربے، مزاج، پیشے، ماحول، استعداد، سماجی حالات اور سنی سنائی باتوں پر بھی ہوتا ہے۔ تاہم مصنف کا کہنا ہے کہ ان سب کی چھان پھٹک کرنے اور ان پر غور کرنے کے بعد اس زمانے کے ماحول اور یہاں کے رہنے والوں کی ایک واضح تصویر اس کتاب میں ضرور سامنے آجاتی ہے۔

مصنف کے مطابق اس کتاب میں درج ہندوستانی معاشرہ، یہاں کے عقائد اور رسم ورواج کے مشاہدات مسلمانوں نے بھی کیے اور یوروپی افراد نے بھی۔ دونوں کے مشاہدات میں بڑی حد تک یکسانیت محسوس ہوتی ہے لیکن مصنف کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے بیانات میں اس زمین اور یہاں کے لوگوں سے جس درجے کی نرمی اور لگاؤ کا احساس سامنے آتا ہے، وہ یوروپی ذرائع میں کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف نے اس کتاب کے باب پانچ میں چند یوروپی سیاحوں کے بیانات بھی شامل کیے ہیں تاکہ تقابلی مطالعہ کرکے اس کا اندازہ ہوسکے۔ مصنف نے اپنی کتاب کے پیش لفظ میں اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ مسلم واقعہ نویس ایک فاتح اور حکمراں قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ جس زمانے میں یہ سب باتیں لکھ رہے تھے وہ دَور روشن خیالی کا نہیں بلکہ مطلق حکمرانی کا تھا، رائے عامہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور بین الاقوامی سوچ کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس لیے وہ اس ملک کے لوگوں کے رہن سہن، رسم ورواج اور عقیدے کے بارے میں احساسِ برتری اور فخر سے بھی بھرپور غلط اور الٹی سیدھی باتیں بھی لکھ سکتے تھے۔ مصنف آگے لکھتے ہیں۔ لیکن وہ مقامی لوگوں کے متعلق حقارت آمیز بیان نہیں دیتے ہیں بلکہ مجموعی تاثر یہ ابھرتا ہے کہ ان کے بیانات میں ہندوستان سے وابستگی کا جذبہ زیادہ ہے اور اس لیے اکثر اس ملک کی توصیف میں مبالغہ آرائی بھی نظر آتی ہے۔ بلاشبہ یہ بھی صحیح ہے کہ جب وہ فتوحات کے سلسلے میں ہندوؤں سے جنگوں کے متعلق لکھتے ہیں تو کبھی کبھی مقامی لوگوں کو کافر، بت پرست اور بدبخت کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور فخریہ بیان کرتے ہیں کہ انہیں جہنم رسید کردیا۔ مگر اس بیان میں حقارت کا اظہار اپنے دشمن سے ہے، نہ کہ ہندوستان کے لوگوں سے۔ (ص 12)

دوسری طرف مصنف نے موجودہ ہندوستان اور اس کے ہندو باشندوں کے بارے میں کچھ یوں لکھا ہے:

ان بیانات سے جو دوسری تصویر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اس زمانے سے اب تک، صدیاں بیت جانے کے بعد بھی، کچھ زیادہ نہیں بدلا ہے۔ اُس دور کے عقیدے، توہمات، رسم ورواج اور طور طریقے آج اکیسویں صدی میں بھی اسی طرح جاری وساری ہیں۔ (ص 12)

مصنف کے خیال میں ایسا لگتا ہے کہ یہاں انسان کے بنائے ہوئے قوانین کا منشا مذہبی تقدس حاصل کرکے انسانیت کی نشو ونما سے زیادہ معاشرے کے دستور کو قائم رکھنا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی بہت زبردست اکثریت مقامی لوگوں کی ہی رہی جو اپنے پرانے رسم ورواج سے چسپاں رہے اور اس طرح بقیہ مقامی لوگوں پر اپنا اثر ڈالنے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوپائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور ان کے نصب العین کے متعلق اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب کے باب 2 میں مسلمانوں کے جس پہلے دستے کا ذکر کیا ہے، یقینی طور پر اس کا نصب العین کچھ اور تھا لیکن بعد کے مسلم حکمرانوں کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ مصنف بجا طور سے لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا پہلا دستہ سب سے پہلے 644 عیسوی میں ہندوستان پہنچا۔ یہ دستہ دراصل ہندوستان کا جائزہ لینے یا سروے کرنے کے لیے آیا تھا۔ غالباً یہ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے دور کا واقعہ ہے۔ لیکن جب یہ دستہ سندھ پہنچا اور وہاں کے ناسازگار حالات کا مشاہدہ کیا تو خلیفہ کو بڑے مختصر الفاظ میں یوں خبردار کیا پانی کی قلت ہے، پھل عمدہ نہیں ہیں اور ڈاکو دلیر ہیں، اگر تھوڑی سی فوج بھیجی گئی تو وہ سب مارے جائیں گے، اگر بڑی تعداد میں گئے تو بھوک سے مرجائیں گے۔ (ص 25)

اس تاریخی سروے سے اس وفد میں شامل افراد کے فہم وفراست کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور یہ بھی کہ خلیفہ نے ہند سے متعلق اُس رپورٹ پر دوررس فیصلہ کیا۔ سندھ پر 712ء میں محمد بن قاسم، جو عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کا

بھتیجا اور داماد تھا، کی سربراہی میں جو فوج کشی ہوئی اس کا پس منظر وہاں کا مقامی راجا داہر تھا جس نے ڈاکوؤں کے خلاف تعاون کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جنگ میں راجا داہر مارا گیا جس کا باپ خود بھی برہمنوں کی حکومت کا تختہ الٹ کر راجا بن گیا تھا۔ عرب مسلمانوں نے اس کے دار الحکومت برہمن آباد پر جو حیدر آباد کے شمال میں واقع تھا، قبضہ کر لیا۔ لیکن عرب مسلمان، ہندوؤں پر شدت پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو اپنی ذمہ داری پر امن وسلامتی فراہم کیا۔ انہیں مذہب کی تبدیلی پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ یہ کہا گیا کہ انہیں اپنے دیوتاؤں کی پرستش کی اجازت دی جاتی ہے۔ کسی آدمی کو اپنے مذہب پر قائم رہنے سے نہیں روکا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے ہٹایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے گھروں میں جس طرح چاہیں زندگی گزاریں۔ (ص26) انہیں ذمی کا درجہ دیا گیا اور ان کی مذہبی کتابوں کو متبرک مانتے ہوئے عرب مسلمانوں نے سندھ کے ہندوؤں کو بھی اہل کتاب کا مرتبہ دے دیا۔ موجودہ دور کے شدت پسند گروہ کے ہندوؤں میں ذمی لفظ گالی کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور عام ہندوؤں میں یہ غلط فہمی پھیلا کر مسلمانوں سے عام طور پر بدگمان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ ذمی کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ہندوؤں کی جان ومال، عزت وعصمت اور عقیدے کی حفاظت کی ذمہ داری مسلم حکمراں کے ذمہ ہے۔ جہاں تک ٹیکس کا سوال ہے کہ تو ہندوؤں سے بھی لیا جاتا تھا اور مسلمانوں پر بھی یہ پابندی تھی کہ زکوٰۃ کی رقم حکمراں کے بیت المال میں جمع کی جائے۔ گویا ٹیکس عملاً دونوں کے لیے تھا۔ ہندو چونکہ مسلمان نہیں تھے لہٰذا زکوٰۃ نہیں ادا کرتے تھے۔

اسی طرح بت پرستوں کے لیے کافر یا مشرک لفظ ہتک آمیز نہیں ہے۔ دونوں الفاظ قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ کافر (Non-believer) وہ ہے جو یکتا خالق کائنات کا انکار کرے اور مشرک وہ ہے جو ایک حقیقی اللہ (ایشور) یعنی خالق کائنات کے ساتھ دوسرے خداؤں کی عبادت کرے۔

مصنف نے اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ دسویں صدی آنے تک جب اسلامی خلافت دمشق سے بغداد منتقل ہوئی تو تجارت اور صنعت کے فروغ نے اسلامی ایمپائر (Empire) کو دولت سے مالا مال کر دیا تھا۔ آزاد مسلم ریاستیں بھی قائم ہونے لگی تھیں اور وہ خلیفہ کی اطاعت گزاری کو برائے نام قبول کرتے رہے۔ انہی آزاد حکمرانوں میں ایک ترکی فوجی اور غلام الپتگین تھا۔ اس نے افغانستان میں غزنی کے مقام پر اپنی حکومت قائم کی۔ ان حکمرانوں نے سلطان کا لقب بھی اختیار کر لیا۔ اس کے غلام اور داماد سبکتگین نے اپنی سلطنت کو بحیرہ خزر سے پشاور تک بڑھا لیا جس پر اس نے 991 عیسوی میں قبضہ کر لیا۔ محمود غزنوی (971-1030) اسی سبکتگین کا بیٹا تھا جس نے 997 اور 1026 کے درمیان ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ مصنف نے واضح طور پر تاریخی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے محمود کو حملہ آور (Invader) قرار دیا ہے۔ تاہم انہوں نے جذبات سے عاری ہو کر یہ بھی لکھا ہے کہ ان حملوں میں دولت کی ہوس کے ساتھ ساتھ بت پرستی کے خاتمے کا مذہبی جذبہ بھی شامل تھا۔ سومناتھ کا مندر ایسا تھا جہاں سب سے زیادہ دولت جمع تھی، اور یہی فطری طور پر محمود کے حصے کا ہدف رہا۔ (ص28)

فاضل مصنف نے اپنی اس کتاب کے آخری حصے میں 53 حوالوں کے ساتھ واقعہ نویسوں کا مختصر تعارف دیا ہے۔ ان حوالوں میں بابر نامہ، تزک جہاں گیری، ابوریحان محمد بن احمد البیرونی کی کتاب الہند، سفر نامہ ابن بطوطہ، عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ کی تاریخ فرشتہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن حوالہ 23 سے انہوں نے جس کتاب پر اکتفا کیا ہے اس کا نام ہے۔

'The History of India as told by its own Historians - The Papers of H.M. Elliot.'

یہ کتاب آٹھ جلدوں میں ہے جسے جان ڈاوسن (1820-1881) نے ایڈٹ کیا۔ اس میں 154 مسلم تاریخ دانوں کی تحریریں ہیں۔ مصنف نے کتاب اور اس کے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ ایچ ایم ایلیٹ (1808-1853) ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک اعلیٰ عہدے دار تھا جو 1847 میں ہندوستان کے لیے وزیر خارجہ مقرر کیا گیا تھا۔ 1846 میں اس نے شمالی سرحدی صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر کو باقاعدہ ایک تجویز پیش کی تھی کہ وہ مسلمانوں کے ہندوستان میں غلبہ حاصل کرنے کے ابتدائی دور سے سترہویں صدی تک کی تاریخ کے مسودے سرکاری حکمت عملی کے طور پر جمع کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس بلند حوصلہ منصوبے پر عمل کرنے کی ایلیٹ کی ترغیب بڑی حد تک سیاسی تھی۔ لیکن صحت کی خرابی کے سبب چھٹی پر انگلینڈ جاتے ہوئے ایلیٹ کا 20 دسمبر 1853 کو انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد جان ڈاوسن نے ایلیٹ کے جمع کیے ہوئے مواد کی ایڈیٹنگ کی اور آٹھ جلدوں میں ایک ناقابلِ فراموش علمی خزانہ پیش کر دیا جس کا نام ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹوریز رکھا۔ مصنف نے یہاں اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ اقتباسات کے ترجمے کے دوران ایلیٹ نے مسلم حکمرانوں کے اچھے انتظامی اقدامات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح وہ علاؤالدین خلجی اور غیاث الدین تغلق کی بہت سی اصلاحات کا تذکرہ نہیں کرتا ہے۔ کتاب کے تعارفی باب میں ایلیٹ خود اقرار کرتا ہے کہ اگر مطالعہ ان جلدوں کا پوری ذمہ داری اور احتیاط سے کیا جائے تو گزرے ہوئے شاہی خاندانوں کے متعلق سارے شاندار طلسماتی خیالات جو عام طور پر ذہنوں میں موجود ہیں، نابود ہو جائیں گے۔ (ص342)

زیر نظر کتاب کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی حقیقی تاریخ لکھی ہی نہیں گئی اور جو کچھ تاریخ کے نام پر موجود ہے اس میں واقعہ نگاری، آپ بیتی اور احساسات وخیالات ہیں۔ تاہم کچھ

دستاویزی چیزیں ایسی ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے چند استثنائی واقعات کو چھوڑ کر ذاتی طور پر عوام کی بھلائی اور خیر خواہی کو مدنظر رکھا۔ باوجود اس کے کہ ان کے سامنے ہندوؤں کی وہ اکثریت تھی جو اپنے عقاید، رسم و رواج اور بعض انسانیت سوز حرکات سے سماج میں خود اپنے ہندو دھرم کے لوگوں کو توہمات (Superstitions) اور قبیح سماجی رسوم میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بیشتر مسلم حکمرانوں نے یہاں کے باشندوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ان کے دھرم کا مسئلہ سمجھ کر ستی کی ظالمانہ رسم کو بھی نظر انداز کیا۔ مغلیہ حکمرانی کی تاریخ میں ظہیر الدین بابر کے سلسلے میں آج بڑی غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں۔ حالانکہ وہ ایک نرم دل مدبر حکمراں تھا۔ مصنف نے بابر کی ایک خفیہ وصیت جو شہزادہ نصیر الدین محمد ہمایوں کے نام لکھا گیا تھا، اسے من و عن اس کتاب میں درج کیا ہے۔ 11 جنوری 1529 کو لکھا گیا یہ وصیت نامہ بنام ہمایوں اسٹیٹ لائبریری بھوپال میں محفوظ ہے۔ وصیت کچھ اس طرح ہے:

''اے میرے فرزند! ہندوستان کی مملکت میں بہت سارے مذاہب ہیں۔ ان پر غلبہ اور حکمرانی اللہ کی رحمت سے تمہیں بخشی گئی ہیں۔ اب لازم ہے کہ مذہبی تعصّبات تختہ قلب سے بالکل مٹا دیے جائیں، اور ہر مذہب کے ساتھ اس کے دینی اصولوں کے موجب انصاف کیا جائے۔ خصوصی طور پر گائے کی قربانی سے پرہیز کرو کیونکہ یہ عمل ہندوستان کے لوگوں کے دل جیتنے کی طرف لے جائے گا اور ملک کی آبادی شاہی خوشنودی کی تابع رہے گی۔ شاہی حکمرانی کے دائرے میں مندروں اور عبادت گاہوں کی، خواہ وہ کسی مذہب کی ہوں، بے حرمتی نہ کی جائے۔ انصاف کرنے کا ایسا طریقہ اپنایا جائے کہ بادشاہ رعیت سے خوش رہے اور رعیت بادشاہ سے۔ اسلام کا فروغ ظلم کی تلوار کی بہ نسبت حسن سلوک کے ہتھیار کے ذریعے بہتر طریقے سے کیا جا سکتا ہے۔ سُنی اور شیعہ کے جھگڑے پر مت دھیان دو کیونکہ یہ کمزوری اسلام میں ابھی تک جاری ہے۔ رعایا کے مختلف فرقوں کے درمیان چار خصوصی اصولوں کے تحت حکومت کرو تا کہ شہنشاہیت کا جسم مختلف بیماریوں سے پاک رہے۔ مرحوم شہنشاہ تیمور کے مثالی اعمال ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھو تا کہ امورِ حکمرانی میں تم پختہ ہو جاؤ۔''
(ص 59-60)

بابر نامہ جو ظہیر الدین محمد بابر (پ 14 فروری 1483) کی خود نوشت سوانح ہے، اس میں اس نے بالکل سچا اور غیر متعصّبانہ رویہ اختیار کرنے کے عزم صمیم کا اظہار کیا ہے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب و تمدن، معاشرے اور رسم و رواج کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے یہ کتاب ایک اچھی کوشش ہے۔ اس میں مسلم حکمرانوں کی جنگی تاریخ نہیں ہے بلکہ یہاں کے معاشرے کو خود اس دور کے واقعہ نویس اور مورخ کے مشاہدات کے ذریعے سمجھنے کی کسی حد تک کوشش کی گئی ہے۔

مصنف نے ہندوستان کے مذہبی عقائد، ذات پات اور زبان وغیرہ کے ذیل میں البیرونی کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے۔ امیر خسرو کے تغلق نامہ کا بھی حوالہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہندوؤں کے مذہبی عقائد اور تہذیب و تمدن کا کسی حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر تمام مشاہدات و بیانات سے یہ بات واضح ہے کہ ہندوؤں میں ذات پات کا ادارہ قدیم زمانے سے آج تک مستحکم ہے۔ سب سے اونچی ذات برہمن کی ہے۔ اس کے بعد چھتری یا کھتری ہے۔ تیسرا ویش اور چوتھا شودر۔ کہا جاتا ہے شودر برہما کے پیروں سے پیدا ہوئے اس لیے ان کا فرض اوپر کے تینوں ذاتوں کی خدمت کرنا ہے۔ وہ کسی بھی دوسری ذات کے مخصوص کاموں سے دور رہتے ہیں۔

یہ کتاب اس لحاظ سے بھی بے حد دلچسپ اور چشم کشا ہے کہ اس میں ہندو دھرم کے ماننے والوں کے مذہبی رنگوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ بتوں کی پرستش ان کے خمیر میں داخل ہے۔ اپنے اس عمل پر وہ فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو ہندو جتنا مذہبی ہوتا ہے اسی قدر توہم پرستی اس کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتی ہے۔ مذہب کے نام پر رسم و رواج کی پاسداری میں بعض اوقات وہ انسانیت کو بھی فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ (ص 253)

ستی یعنی بیوہ کو جلانے کی شرمناک رسم کے مشاہدات اس قدر کربناک ہیں کہ انسانی تاریخ میں اس طرح کی رسم شاید کسی اور تہذیب میں نہیں ملتی۔ البیرونی لکھتا ہے:

اندرونِ ہند یہ رواج ہے کہ اگر شوہر مر جائے تو اس کی بیوہ اپنی مرضی سے اور خوشی خوشی خود کو (شوہر کی چتا پر) شعلوں کے حوالے کر دیتی ہے، اس بات کے باوجود کہ وہ اس کے ساتھ زندگی میں شاید ناخوش ہی رہی ہو۔ اکثر زندگی کی چاہت اسے بھی روک لیتی ہے، تب اس کے شوہر کے رشتہ دار جمع ہوتے ہیں، چتا کی آگ بھڑکاتے ہیں، اور اس کو اس پر ڈال دیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے خاندان کی عزت اور اس کے طور طریقے بحال رکھے ہیں۔ (ص 242) البیرونی یہ بھی لکھتا ہے کہ شوہر اور بیوی صرف مر کر ہی جدا ہو سکتے ہیں کیونکہ ان کے یہاں طلاق نہیں ہے۔ ایک مرد ایک سے چار تک بیویاں رکھ سکتا ہے۔... ان کے شادی کے قانون کے تحت ایک اجنبی سے شادی کرنا بہتر ہے بہ نسبت ایک رشتہ دار سے۔ ایک عورت کا اپنے شوہر سے رشتے میں جتنی زیادہ دوری ہو بہتر ہوتا ہے۔ (ص 245) البیرونی یہ بھی لکھتا ہے کہ قتل کے معاملے میں قاتل اگر ایک برہمن ہے اور مقتول دوسری ذات کا ہے تو اس کی تلافی کے لیے وہ صرف برت رکھنے، پوجا کرنے اور خیرات دینے کا پابند ہے۔ (ص 257) البتہ میموریز آف ہمایوں (ترجمہ: میجر چارلس اسٹوارٹ) کے حوالے سے ہندوؤں کی مہمان نوازی کی تعریف کی گئی ہے۔ اسی طرح تزک جہانگیری کے حوالے

سے لکھا گیا ہے کہ ہندوؤں میں مخیّرانہ کام کی بڑی اہمیت ہے۔اس ضمن میں گجرات کے ایک واقعہ کا ذکر بھی ہے۔(ص 259)

نکولا ومنّوچی (پ 1639) وینس کا رہنے والا تھا۔ وہ 1656 میں ہندوستان پہنچا۔اس کی کتاب شاہجہاں اور اورنگ زیب کی حکومتوں کے واقعات کو بڑی تفصیل سے پیش کرتی ہے۔وہ اپنی کتاب اسٹوریا ڈوموگوریا مغل (ترجمہ ولیم ارون) میں لکھتا ہے۔

بنیا ہندوؤں کا وہ طبقہ ہے جو نہ گوشت کھاتا ہے نہ مچھلی بلکہ صرف اناج، سبزی، دودھ اور کافی مقدار میں مکھن استعمال کرتا ہے۔وہ گائے پالنے کے شوقین ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس کی پرستش کرتے ہیں۔وہ گائے کے اتنے معتقد ہوتے ہیں کہ اپنی نجات کی ساری امیدیں اس سے لگائے ہوتے ہیں، اتنی زیادہ کہ موت کی تکلیف کے وقت وہ گائے کی دُم پکڑ لیتے ہیں اور اس کو ہاتھ میں تھامے مرجاتے ہیں۔(ص 313)

وہ آگے لکھتا ہے کہ قاری کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ صرف بنئے ہی نہیں ہیں جو گائے کی پوجا کرتے ہیں بلکہ سارے ہندو ایسا کرتے ہیں چاہے زندگی کے کسی مقام پر ہوں۔لیکن بنئے اس معاملے میں زیادہ آگے ہیں۔(ص 314)

اس بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں گائے کی پرستش کی وجہ سے یہ مسئلہ کتنا حساس ہے۔اس لیے مسلمانوں کو جو اس زمین سے تعلق رکھتے ہیں یقینی طور پر فہم وفراست کا ثبوت دیتے ہوئے احمقانہ اقدام سے اجتناب کرنا چاہیے۔اس معاملے میں جذباتیت کا شکار ہونا ایک ابلیسی عمل ہے جو آزمائشوں کو دعوت دیتا ہے۔جس قوم میں گائے، موت وحیات کا مسئلہ ہو، قابل پرستش ہو، اس سلسلے میں انتہائی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ ہی مناسب ہے۔ملک کی ہندو برادری عام طور پر امن پسند رہی ہے۔چند شدت پسند ہندوؤں کا گروہ ہر دور میں مذہبی جنون اور آستھا کے نام پر خود ہندوؤں پر ظلم وتشدد کرتا رہا ہے۔موجودہ دور کا ہندتو بھی اسی قبیل کا ہے۔مسلمانوں کے نزدیک خالق کائنات ایک ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں، وہی کائنات کا مالک اور رب ہے جس نے قرآن میں اپنا تعارف اللہ کے طور پر کرایا ہے۔ہزاروں سال قبل سنسکرت میں ممکن ہے کہ ایشور ہی کہا جاتا ہو لیکن بتوں کی پرستش کو اسی خالق کائنات نے ناجائز قرار دیا ہے جو اللہ ہے۔یہ بات منطقی ہے کہ اس یکتا رب کو چھوڑ کر اس کی تخلیقات کی پوجا خود خالق کائنات پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔زمین اور آسمان اسی کا ہے اور وہ ہر چیز کا خالق ہے۔اس بات کو اگر ہندو نہیں سمجھتے ہیں تو ان کے حال پر انہیں چھوڑ دینا چاہیے اور ان کی سلامتی کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ان کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ مسلمان ان کے حریف (rival) نہیں بلکہ بھائی ہیں جن کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا ہے جو آدم اور حوا کی رگوں میں تھا۔مسلمان ان کے دشمن نہیں بلکہ خیر خواہ ہیں۔مسلمان ایک اللہ ہی کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کا ادراک رکھتے ہیں کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو رب العالمین ناراض ہوجائے گا۔مسلمان کی خیر خواہی یہ ہے کہ جس طرح وہ خود کو رب العالمین کی ناراضی سے بچانا چاہتے ہیں اسی طرح وہ اپنے ہم وطن بھائیوں کو بھی بچانا چاہتے ہیں۔لیکن اس معاملے میں کبھی کوئی زور زبردستی نہیں رہی ہے۔شدت پسندی کسی بھی انسان کے لیے پسندیدہ نہیں ہے، مسلمان کے لیے کیسے ہوسکتی ہے۔مسلمان اللہ رب العالمین کی کسی بھی تخلیق کی پوجا نہیں کرتے۔سورج، زمین، پہاڑ، درخت، ندی سب ایک ہی اللہ یا ایشور کی حسین تخلیقات ہیں جو تمام مخلوقات (Creatures) کی بھلائی کے لیے بنائی گئی ہیں۔انسان تو پیدائشی اور فطری طور پر ایک ہی اللہ کا بندہ ہے۔لیکن جب وہ بڑا ہوتا ہے تو آستھا کے نام پر رسم و رواج میں جکڑ دیا جاتا ہے۔آستھا در حقیقت انسانی نفس ہے جو اسے ہر اس کام کے لیے اکساتی ہے جو خلافِ عقل اور خلافِ فطرت ہے۔اور جو کام خلاف عقل اور فطرت ہو، یقینی طور پر انسان اور انسانیت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔

دوسری اہم بات یہ کہ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں سے جو بھی غلطیاں ہوئی ہیں نہ ان کا ہم دفاع کرسکتے ہیں اور نہ ہی جواز فراہم کرسکتے ہیں۔انسان جب کسی وجہ سے نفس کا غلام ہوجاتا ہے تو ایک اللہ کی غلامی وبندگی سے کچھ دیر کے لیے دور ہوجاتا ہے، بھلے ہی اس کا نام مسلمانوں جیسا کیوں نہ ہو۔تاج محل دنیا کی ایک خوبصورت اور شاہکار عمارت ضرور ہے لیکن اس مقبرہ کے لیے اللہ کا دین اجازت نہیں دیتا۔البتہ مسلم حکمرانوں نے اس ملک کی بقا اور ترقی کے لیے جو اچھے اور اصلاحی کام کیے ان کو یقینی طور پر اجاگر کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں وطن عزیز کے ہندو بھائیوں کو بھی کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے۔عقل مندوں اور دانشوروں نے اس کا مظاہرہ ضرور کیا ہے۔ان میں ایک نام جناب بی این پانڈے (سابق گورنر بہار واڑیسہ) کا ہے جنہوں نے کسی بھی تعصب کے بغیر بعض مغل حکمرانوں کی دریادلی کا خاص طور سے اعتراف کیا ہے۔انہوں نے دستاویزی ثبوت کے ذریعے اورنگ زیب پر لگائے گئے ہندو دشمنی کے الزامات کی نفی کی ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی بھی مسلم حکمراں ہمارا رول ماڈل نہیں ہوسکتا ہے۔اگر کوئی مسلمان ایسا سوچتا ہے تو اسے اپنے رب پر کتنا ایمان ہے اپنے دل کو ٹٹولنا چاہیے۔ہمارے رول ماڈل تو صرف اور صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ہیں جنہوں نے دنیا کو جینے کا سلیقہ بتایا اور جو رحمت للعالمین ہیں۔فاضل مصنف کی یہ کتاب ہندوستان کے موجودہ تناظر میں خاص طور سے بے حد اہم ہے۔اس کی اشاعت پر فاروس میڈیا مبارک باد کی مستحق ہے۔اس کتاب کا مطالعہ اردو کے ہر قاری کو کرنا چاہیے۔

MOHAMMAD ARIF IQBAL
Editor, Urdu Book Review,
Delhi

مقدس مہینے میں!

جتیندر نرموہی

رفیقن چاچی کی آواز آرہی تھی ''نالائقوں نے کچھ نہ چھوڑا، گھِیسا کی چھوری کو لوٹ لیا''۔ گھِیسا مالی کے گھر کے باہر بھیڑ اکٹھی ہوتی جارہی تھی۔ لوگ اس میں شامل ہوتے جارہے تھے۔ رفیقن چاچی پھر چلائیں ''نامرادو! یہاں کیا تماشہ لگ رہا ہے جو میلے کی طرح جٹے جارہے ہو؟ چلو بھاگو یہاں سے!''۔ سر پھرے لڑکے سمٹتے اور کھسکتے بنے۔ رفیقن اندر گئیں اور اعتماد میں لے کر گلاب سے سب کچھ پوچھ لیا۔ گلاب نے کہا ''رات کے اندھیرے میں جب میں پھول پیچ کر لوٹ رہی تھی، نیم کے پاس گڑھ کی دیوار کے پاس سے دولڑکے مجھے بکسے میں بند کر کے لے گئے۔ انہوں نے گاڑی میں ڈالا اور مجھے لے گئے۔ کہاں لے گئے یہ مجھے نہیں معلوم۔ انہوں نے میرے ساتھ زبردستی کی اور تڑکاؤ پھاٹک کے پاس واپس چھوڑ دیا''۔ گلاب کی ماں نے کہا ''رہبا دو۔۔۔ جو ہویو، سو ہویو۔۔۔ راکھو یان نے منہ کالا کر، دَھر دِیو''۔ رفیقن چاچی بولیں ''ارے واری! کیسے چھوڑ دیں، منہ کالا تو ان کمینوں کا ہوا جنہوں نے چھوری کے ساتھ جبراً زنا کیا، انہیں خدا بخسے گا نہیں!''

محلے میں رفیقن چاچی کو بولڈ مانا جاتا تھا۔ وہ جو ٹھان لیتی تھیں، پورا کر کے رہتی تھیں۔ ان کے دل میں کیا چل رہا ہوتا تھا، یہ یا تو صرف وہ جانتیں یا خدا جانتا۔ ان کے تین چھورے متین، مبین، رئیس بھی بڑے قسمت والے تھے، ان کی نیشنل ہائے وے پر مستری کی دکان تھی۔ اماں جب وارڈ کونسلر بنی تھیں، اس سے پہلے ہی ابا نے وہ زمین خرید لی تھی۔ چاچی کی تین چھوریاں بھی تھیں۔ رخسانہ، فیروزہ اور فریدہ۔ داماد بھی سب اچھے خاصے خوش حال تھے۔

گلاب کا باپ گھِیسا بڑا سیدھا آدمی تھا۔ اپنے گھر سے سیدھا آتا، سیدھا جاتا۔ اس کی بیوی اور چھوریاں شہر کے بڑے بازار میں بیٹھتیں، مالائیں بیچتیں۔ گھِیسا کی بہو نے کہا ''چاچی! رہبا دو۔۔۔ لوگ ہم غریبن کا مجاک بنا دے گا''۔ چاچی نے کہا ''ارے واری! غریب کب سے ہوگئی تھاری چھوری؟ چاچی تھارے ساتھ چھیں''۔ آناً فاناً چاچی نے اپنے چھوروں سے گاڑی منگوائی

اورگلاب، اس کے ماں-باپ دونوں کو بٹھا کر تھانہ پہنچ گئیں۔ تھانے دار سارا ماجرا دیکھ کر آگے پیچھے ہونے لگا۔ رفیقن چاچی بولیں ''تھانے دار جی، نئے نئے آئے ہو شہر میں، رفیقن کو نہیں جانتے، رپورٹ درج کرو''۔ تھانے دار بولا ''بیٹھیے بہن جی، ابھی درج کرتا ہوں۔'' تھانے دار رپورٹ درج کرنے کے لیے سوچتا اس پہلے ہی چاچی نے شہر کے ایم ایل اے کو فون کر کے تھانے دار کو پکڑا دیا۔

فون پر تھانے دار کی آواز یس سر یس سر کرتی سنائی دی۔ چاچی سب جانتی تھیں کہ معاملے میں دیری کا مطلب لیپا پوتی۔ چاچی نے شہر کے میڈیکل افسر کو فون لگا کر پورا معاملہ سمجھا دیا اور کہا کہ رپورٹ جلد سے جلد چاہیے۔ میڈیکل افسر بھی رفیقن چاچی سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ مستعدی سے میڈیکل رپورٹ تیار کرنے میں لگ گئے۔

معاملے نے زور پکڑا، تفتیش شروع ہو گئی۔ اس معاملے سے جڑے دوسرے فریق نے بھی زور لگایا۔ ایک روز رات کو چاچی کے پاس فون آیا۔ چاچی نے فون اٹھایا۔ آواز آئی ''السلام علیکم چاچی، مقبول ایڈوکیٹ بول رہا ہوں۔'' چاچی نے کہا ''وعلیکم السلام۔'' مقبول ایڈوکیٹ نے کہا ''چاچی، کیوں خواہ مخواہ غیر نجی معاملے میں پڑ رہی ہیں، معاملے سے جڑی دوسری پارٹی بڑے رسوخ والی ہے، اور وہ اپنے ہی لوگ ہیں۔'' چاچی نے کہا ''مجھے دین اور ایمان سکھانے والے وکیل صاحب، آپ کون ہوتے ہیں اپنے پرائے کی پہچان کرانے والے، رمضان کے اس مقدس مہینے میں خدا کے بندوں سے زیادہ رسوخ والا کون ہو سکتا ہے!'' مقبول وکیل بولے ''آپ کو معاملے کو سمجھنا ہوگا، اس کیس سے ہٹ جانا ہوگا۔ میں فقیروں کی مسجد کے پاس رہتا ہوں، معاملہ اثر دار لوگوں کا ہے۔'' چاچی بولیں ''وکیل صاحب! آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں یا التجا کر رہے ہیں؟'' مقبول وکیل نے کہا ''آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کو مشورہ دے رہا ہوں۔ سامنے والے سے میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔''

رفیقن چاچی بڑی سمجھ دار تھیں اور وہ مقبول وکیل کی پہنچ بھی جانتی تھیں۔ وہ تھوڑی ڈھیلی سی ہو گئیں، جیسے پانسہ پلٹ گیا ہو، ویسے بات کرتے ہوئے انہوں نے مقبول وکیل کے اشاروں کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ مقدمہ کی کمزوریاں انہیں معلوم ہو چکی تھیں۔ وہ جان چکی تھیں کہ کیس اچھا بنا ہے، میڈیکل رپورٹ بھی اچھی ہے، سوائے چشم دید گواہ کے۔ حادثے کا کوئی چشم دید گواہ نہیں تھا۔

رفیقن چاچی کا ذہن کسی ادھیڑ-بُن میں لگ گیا۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو بلایا ''دیکھو تمہیں خدا رسول کا واسطہ، ان دنوں میں جو کچھ کر رہی ہوں، تمہارے خیال میں مَیں صحیح کر رہی ہوں یا نہیں؟'' تینوں بیٹوں نے ایک ساتھ کہا ''امی، خدا جانتا ہے آج تک ہم آپ کے ساتھ رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں جو ہماری امی کر رہی ہیں وہ صحیح کر رہی ہیں اور آگے بھی وہ صحیح کریں گی۔''

رفیقن چاچی نے کہا ''تو پھر سنو! میں گھیسا بھائی کے وکیل بنشی دھر یادو کے پاس جا رہی ہوں، چشم دید گواہ کے طور پر!'' مبین بولا ''لیکن امی، آپ تو وہاں تھیں ہی نہیں؟'' چاچی نے کہا ''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو، میں آج تک اپنی زندگی میں ناکام نہیں ہوئی ہوں۔ ان شاء اللہ ہمیں کامیابی ملے گی۔'' مبین نے پوچھا ''امی، کیا یہ بھی آپ دین اور ایمان کے لیے کر رہی ہیں؟'' چاچی نے جواب دیا ''ہاں بالکل! تم گاڑی نکالو، اب میں چلی''

رفیقن چاچی بنشی دھر ایڈوکیٹ سے ملنے روانہ ہو گئیں۔ سچائی پر چلنے والے مظلوموں کا ساتھ دینا ہی ان کا دین اور ایمان تھا۔

Jitendera Nirmohi
B-422, RK Puram, Kota, Rajasthan
Email:jitendra.normohi53@gmail.com

تربیت میں تسلسل ناگزیر

جرار احمد

کائنات کو صانع عالم نے بہت ہی سلیقے اور ترتیب کے ساتھ سجادیا ہے۔ اس کی بناوٹ اور سجاوٹ میں کہیں رتی برابر بھی جھول نہیں۔ آج بھی دمادم صدائے کن فیکون آرہی ہے اور تمام چیزیں تسلسل کے ساتھ تخلیق ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اس تخلیق میں انسان کو اشرفیت کا درجہ ملا مگر افسوس کہ انسان تسلسل سے تساہل اور ترتیب سے تغافل برتتا چلا جارہا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے کسی کام میں خالق عالم کی خلاقی کا شائبہ نظر نہیں آتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں بہت سارے افراد اولاد کی تربیت ونگہداشت کو لے کر کافی پریشان رہتے ہیں۔ گلی محلے میں سرپرست حضرات اکثر اس بات کے شاکی ہوتے ہیں کہ "ارے یار کیا کریں؟ لڑکے کو کتنا بھی کو سمجھا رہا ہوں، ڈانٹ رہا ہوں، مار رہا ہوں، مگر اس پر کچھ اثر نہیں ہو رہا ہے اور وہ پڑھنے لکھنے کی طرف راغب ہی نہیں ہو رہا ہے! کیا کروں؟ میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔۔ اس کے مستقبل کے تئیں فکرمند بھی ہوں۔۔!"۔ مگر معلوم کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ سرپرست ہفتے میں یا مہینہ میں ایک بار خوب پٹائی یا ڈانٹ لگا دیتے ہیں پھر ہفتہ، مہینہ بھر بعد جب کبھی موڈ خراب ہوا تب دوبارہ بچے کی شامت آئے گی۔ اسے تربیت اور نگہداشت نہیں کہتے بلکہ اسے اپنی بھڑاس نکالنے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ زبردستی مار پیٹ کر کسی کی عادات واطوار میں لائی گئی تبدیلی کو کبھی دوام حاصل نہیں ہوگا اور نہ وہ تبدیلی اس کی زندگی اور عادت کا حصہ ہی بنے گی۔ اولاد کی تربیت سمجھا بجھا کر، دانشمندی کے ساتھ آہستہ آہستہ تسلسل کے ساتھ ہونی چاہیے۔ ہر کام کے بہتر نتیجہ کے لیے اس میں تسلسل ضروری ہے۔ یہی معاملہ تربیت کا بھی ہے۔ تسلسل سے تغافل کسی بھی صورت میں نہیں کیا جاسکتا۔ ہر روز بچوں کو سمجھانے کے ساتھ سبق آموز قصے کہانیاں سناتے رہنا چاہئے۔ انہیں اپنے اور گھر کے حالات کے ساتھ معاشرے کے مسائل اور پریشانیوں سے بھی آگاہ کرتے رہنا چاہیے تاکہ وہ ان تمام چیزوں کے تئیں حساس ہوں۔ جب ہم کسی کے اندر کسی چیز کے تئیں احساس کو بیدار کردیتے ہیں تو اس چیز کے تئیں اس شخص کا رویہ بدل جائے گا اور جب خود سے کسی چیز کے تئیں کسی شخص کا رویہ بدلتا ہے تو وہ چیز اس کی عادت میں شامل ہو جاتی ہے اور جو چیز خود سے عادت کا حصہ بن جاتی ہے اس کو دوام حاصل ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے کی گئی تربیت کو بھی دوام حاصل ہوگا۔

کسی بھی عمل میں میانہ روی بہت ضروری ہے۔ اسی لیے دین مصطفوی میں افراط وتفریط دونوں سے منع کیا گیا ہے۔ بھوکے رہنا جتنا نقصاندہ ہے اس سے کئی درجہ زیادہ نقصان بھوک سے زیادہ کھانا کھا لینے میں ہے۔ اسلام ایک مکمل ضابطِ حیات ہے، اس ضابطے کے تحریری دستاویز قرآن مجید کو رب العالمین نے یک بارگی نازل نہیں فرمایا بلکہ وقت، ضرورت اور موقع ومحل کی مناسبت سے تسلسل اور تواتر کے ساتھ نازل فرمایا۔ تاکہ لوگ اسے سیکھنے کے ساتھ ساتھ اس پر عمل کرنے کے بھی عادی ہوتے چلے جائیں۔ ایک دن کی ڈانٹ سے سدھرنے سے زیادہ بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اگر کوئی فی الواقع اپنے اہل وعیال کی تربیت کا خواستگار ہے تو اسے سنت مصطفوی کے مطابق میانہ روی اختیار کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ سنت خداوندی کی پیروی کرتے ہوئے اولاد کی بتدریج تربیت کے لیے وقت نکالا جائے تو یہ عمل پیہم رائیگاں نہیں جائے گا۔

JARAR AHMED,
Senior research scholar,
Dept Education , MANUU
jarrarurb.rs@manuu.edu.in

پیش کش: نجم السحر

معصومیت

یہ ڈیریک ہے۔ یہ میزورم کا رہنے والا ہے۔ عمر چھ سال ہے۔ جس عمر میں، ہم اپنی دادی- نانی سے کہانیاں سنتے ہیں اس عمر میں انہوں نے خود ایک کہانی کو جنم دیا ہے۔ یہ تصویر ایک نرس نے اپنے کلینک پر کھینچی ہے۔ ہوا یوں تھا کہ ڈیریک اپنے گھر کے باہر گلی میں اپنی چھوٹی سی سائیکل سے محلے کے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ تبھی اچانک ایک مرغی کا بچہ ان کی سائیکل کے نیچے آجاتا ہے۔ ڈیریک گھبرا جاتا ہے۔ رونے لگتا ہے۔ اُس کے گال لال ہو جاتے ہیں۔ بدحواسی میں ڈیریک مرغی کے اس بچے کو اٹھا کر گھر کی جانب دوڑتا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں مرغی کا ایک مرا ہوا بچہ دیکھ اُس کے ابا ماجرا پوچھتے ہیں۔ وہ کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔ ڈیریک کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ کپکپاتی آواز سے مرغی کے بچے کو ہسپتال لے جانے کی ضد کرتا ہے۔ اُس کے ابو اس کی معصوم ضد پر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ وہ ڈیریک سے پوچھتے ہیں کہ گھر سے نکلتے وقت تمہیں جو پیسے دیئے تھے وہ کہاں ہیں؟ ڈریک جیب ٹٹولتا ہے۔ اس کے جیب میں گیلا سا دس روپے کا ایک نوٹ ہوتا ہے جسے لے کر وہ خود ہی ڈاکٹر انکل کے کلینک کی جانب اپنی اسی سائیکل پر سوار ہو کر دوڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایک چھ سال کے بچے کو دیکھتے ہیں جس کے ایک ہاتھ میں مرغی کا ایک مرا ہوا بچہ ہے اور دوسرے ہاتھ میں دس روپے کا ایک نوٹ۔ وہ روتا ہوا ڈاکٹر انکل سے کہہ رہا تھا کہ ''پلیز اسے بچا لیجئے!'' ڈاکٹر ایسی معصومیت پر حیران ہیں۔ اُن کے بس میں ہوتا تو اپنی عمر بھر کی ڈاکٹری کے عوض ایک ایسا آخری انجکشن حاصل کر لیتے جو مرغی کے اس بچے کو زندہ کر دیتا۔ ڈیریک کو نہیں معلوم ہے کہ مرغی کا جو بچہ اُس کے ہاتھ میں ہے وہ مر چکا ہے۔ ڈیریک تو بس اپنے قیمتی دس کے نوٹ سے اس بچے کو بچا لینا چاہتا ہے۔ مرغی کا بچہ مر گیا، مگر ڈیریک نے اپنا بچپن بچا لیا جس کی قیمت اس مرغی کے بچے سے بالکل کم نہیں ہے۔

استاد نے جماعت کے لائق ترین بچے کو سمجھایا کہ کل جب آفیسر اسکول کا معائنہ کرنے آئے تو وہ پوچھے گا کہ آپ کو کس نے پیدا کیا ہے، تو تم جواب دینا کہ اللہ تعالیٰ نے۔
دوسرے دن جب آفیسر اسکول کا معائنہ کرنے آیا تو اس نے بچوں سے پوچھا: آپ کو کس نے پیدا کیا؟
بچوں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ جب دو تین بار پوچھنے پر بھی کوئی جواب نہ ملا تو ایک بچے نے اٹھ کر جواب دیا: سر، جس بچے کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تھا وہ آج چھٹی پر ہے!

مہمان نے بچے سے پوچھا: تمہارا فیوچر پلان کیا ہے؟
بچہ: کچھ نہیں، مودی جی کے پندرہ لاکھ روپئے آئیں گے تو بارہ لاکھ فکس ڈپازٹ میں رکھ کر تین لاکھ میں کسی اچھی لڑکی سے شادی کر کے گھر داماد ہو جاؤں گا راہل گاندھی جی سے ہر سالانہ آنے والے 72 ہزار روپیوں سے ہر سال، ہم میاں بیوی کسی اچھے شہر گھومنے جائیں گے۔ اور زندگی آرام سے گذر جائے گی۔

☆ مسلسل ایک گھنٹہ ہیڈ فون استعمال کرنے سے آپ کے کان میں موجود بیکٹریا کی تعداد میں 700 گنا اضافہ ہو سکتا ہے!

☆ بہت سے انسان اپنی زبان سے اپنی کہنی نہیں چھو سکتے! یقین نہ آئے تو کوشش کر کے دیکھ لیں!

☆ ہاتھی ایسا واحد جانور ہے جو چھلانگ نہیں لگا سکتا۔

کہتے ہیں کہ انگریزی زبان کا درج ذیل جملہ ادائیگی کے لحاظ سے سب سے مشکل جملہ ہے۔ کیا آپ کے لیے بھی یہ مشکل ہے؟ کوشش کر کے دیکھیں:
Sixth sick sheikh's sixth sheep's sick

دور جدید میں انسانی فکر کی رسائی اور وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس کے احاطہ فکر سے باہر ہو۔ اس ترقی کے شانہ بہ شانہ ایک مایوس کن پہلو یہ ہے کہ اس فکری ارتقاء کے سفر میں انسان تن تنہا بغیر کسی رہنما کے، نکل پڑا ہے۔ نتیجے میں وہ راہ راست سے پھر کر منزل سے دور ہوتا جارہا ہے۔ انسان ایسے صحرا میں جا پھنسا ہے جہاں اسے امید کے مختلف سراب تو نظر آتے ہیں لیکن ان کے قریب جاتے ہی اسے مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

کچھ ایسا ہی معاملہ عالمی معاشی افکار اور ان کے نظریہ ساز و علمبرداروں کا ہے۔ مادہ پرستانہ سرمایہ داریت پر مبنی جدید معاشی نظام شدید بحران کا شکار ہو چکا ہے۔ اس بحران میں دن بدن اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس محاذ سے تعلق رکھنے والے اسلامی فکر کے حامل افراد معیشت انسانی کی ایک نئی عمارت کی تعمیر کا بیڑا اٹھائیں۔ دنیا کے سامنے عدل و مساوات پر مبنی ایک فطری نظام معیشت پیش کریں۔ اس کام کی انجام دہی کے لئے ڈاکٹر معروف اسکالر ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کے ماہنامہ رفیق منزل فروری اور مارچ میں قسط وار شائع ہوئے دو اہم مضامین سے اخذ کردی درج ذیل نکات مفید ثابت ہو سکتے ہیں:

1) قرآن و سنت کی روشنی میں کچھ نئے اصول وضع کرنے کی ضرورت ہے۔ جو بدلے ہوئے حالات میں مقاصد شریعت کی تکمیل میں مدد و معاون ثابت ہوں۔ جنہیں بنیاد بنا کر جدید معاشی مسائل کے حل مصالح اور نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے پیش کیے جاسکیں۔

2) علم معیشت اسلامی کی تعلیم کے لیے روایتی طریق تدریس کے بجائے تجرباتی مطالعہ پر مبنی طریق تدریس اختیار کیا جائے۔

3) ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو حالات کے لحاظ سے قدیم اسلامی معیشت پر نئے غور و فکر کا کام انجام دیں اور ایک ایسا زری و مالیاتی تصور تخلیق کریں جو ساری دنیا کے لئے قابل قبول اور قابل عمل ہو۔

ہندوستانی سماج میں کئی ایسے مسائل ہیں جو قیاسی و نظری دلائل کے ساتھ زمینی حقائق پر مبنی سروے کے ذریعے پیش کیے گئے حل کے محتاج ہیں۔ اگر ہم سماج میں مثبت تبدیلی کا خواب دیکھتے ہیں تو ہمیں زمینی حقائق سے جڑے، کچھ عملی اقدام کر کے، مسائل حل کرنے چاہئیں۔

عبداللہ امین (جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ)

ایس آئی او تعلیمی اداروں میں جمہوری فضا بحال کرنے کی کوشش کرے گی

نئی دہلی: ایس آئی او آف انڈیا نے اپنے ہیڈ کوارٹرس میں نیشنل کیمپس کمیٹی میٹنگ کا انعقاد کیا۔ برادر سید اظہر الدین (جنرل سکریٹری، ایس آئی او آف انڈیا) نے اس میٹنگ کا افتتاح کیا جب کہ برادر شبیر سی۔ کے۔ (قومی سکریٹی، ایس آئی آف انڈیا) نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ ایس آئی او کے دیگر قومی سکریٹریز برادر طلحہ ابدال، برادر فواز شاہین اور برادر معاذ سلمان منیار نے بھی خطاب کیا۔

ایس آئی او کی نیشنل کیمپس کمیٹی (NCC) نے ملک کے تعلیمی اداروں میں طلبہ مخالف اور غیر جمہوری ماحول کو سیاسی اور قانونی دونوں سطح پر ختم کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اس وقت ملک کے تعلیمی اداروں میں آزادی اظہار رائے پر پابندی لگا کر ایک غیر جمہوری فضا کو مسلط کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، اس تناظر میں نیشنل کیمپس کمیٹی نے تعلیمی اداروں میں ایسی جمہوری فضا کو بحال کرنے کا فیصلہ کیا جہاں ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی میسر ہو۔ ہر شخص اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ملک میں جاری نظریاتی بحثوں میں سرگرم شرکت کر سکے۔

نیشنل کیمپس کمیٹی کی میٹنگ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ تعلیمی اداروں کو باقاعدہ انتخابات کے ذریعے طلبہ یونین کے نظام کو اپنانا چاہیے، کیوں کہ دیکھا یہ جارہا ہے کہ طلبہ اور طالبات پر انہی تعلیمی اداروں میں زیادہ تشدد ہو رہا ہے جہاں طلبہ یونین یا طلبہ کی اسوسی ایشن بنانے پر پابندی ہے۔ اس ضمن میں ایس آئی او نے فیصلہ کیا کہ ایس آئی او طلبہ پر تشدد نہ کرنے کے سلسلے میں لنگدو (Lingdo) کمیشن اور سپریم کورٹ کی سفارشات کی روشنی میں طلبہ پر تشدد ختم کرنے کے لیے تمام ممکن قانونی اقدامات کرے گی۔ نیز، اگر ضروری محسوس ہوا تو، ایس آئی او انصاف کی اس جدو جہد میں سماج کے تمام طبقات کو ساتھ لے کر منظم طور سے احتجاج بھی کرے گی۔

(ادارہ)